دور کی آواز

افسانے

دور کی آواز

(افسانے)

فیروز مکرجی

پہلی اشاعت: جولائی ۲۰۰۱ء

اہتمام: سٹی پریس بک شاپ، کراچی

طباعت: ذکی سنز پرنٹرز، کراچی

قیمت: (پاکستان میں) 150 روپے

(بیرون ملک) 10 ڈالر

ملنے کا پتا:

Dr. Feroze Mookerjee,
62, Windermere Road,
Muswell Hill,
London N10 2RG, U.K.

سٹی پریس بک شاپ

316، مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی 74400

فون: 5213916 ,5650623 (21-92)

ای میل: city_press@email.com

انٹرنیٹ: www.PakistaniBooks.com

ترتیب

انتساب

میرے والد مرحوم

عاشق حسین صاحب

کے نام

جنھوں نے مجھے پہلی بار ادب سے روشناس کرایا

فیروز مکر جی

پروفیسر محمد حسن

دیباچہ

۱۹۹۱ء کے شروع میں جب میں لندن ذرا طویل قیام کے لیے پہنچا تو خلیجی جنگ پر فیروز مکرجی کا ایک چھوٹا سا افسانہ ''جنگ'' لندن میں پڑھ کر حیران رہ گیا۔ یوں اس سے پہلے ان کی افسانہ نگاری سے بے خبر نہیں رہا تھا کہ میرے سہ ماہی رسالے ''عصری ادب'' میں ان کے کئی افسانے شائع ہو چکے تھے مگر حیرانی خلیجی جنگ جیسے وقتی موضوع پر ایسا زندہ رہنے والا افسانہ پڑھ کر ہوئی جس میں کوئی بات نہ تو ہنگامی تھی اور نہ وقتی۔ وہ دن ہے اور آج کا دن، میں نے فیروز کو اردو کا اہم افسانہ نگار مان لیا۔ یہ خاموش قسم کی بظاہر خود اپنے میں گم خاتون نہ جانے تخیل کے کیسے کیسے تانے بانے بنا کرتی ہیں اور ان میں کس قسم کے آگہی اور احساس کی تڑپ جاگزیں کر دیتی ہیں، یہ ان کے افسانے پڑھ کر ہی سمجھا جا سکتا ہے۔

فیروز کا ذہنی اور جذباتی سفر ہی نہیں عملی زندگی کا سفر بھی مختلف قسم کے موڑ پھیر سے ناآشنا نہیں۔ وہ مزاج کے اعتبار سے تجربوں اور عجیب و غریب مشاہدوں کی رسیا نہیں مگر روایت کی پابند اور پرانے رسم و رواج کی قیدی بھی نہیں۔ ہاں اپنے طور پر جانے انجانے راستوں پر چل کر خود اپنے مشاہدات سے نتیجے نکالنے اور خاموشی سے ان پر عمل کرنے کی قائل ہیں جن میں بعض پر جب عمل نہیں کر پاتیں تو انہیں افسانوی شکل میں ڈھال لیتی ہیں۔ ہر افسانے میں ان کی شخصیت تلاش کرنا بے سود ہے۔ حد یہ ہے کہ ان افسانوں میں بھی جن میں واحد متکلم کا استعمال ہوا ہے وہ شاید ہی کہیں جوں کی توں موجود ہوں۔ مگر ان افسانوں کے مرکزی تاثر کے پیچھے، بہت پیچھے فیروز کا فکری وجود زندگی کی کسی گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرتا نظر آئے گا۔ گو یہ ضروری نہیں ہے کہ گتھی سلجھ ہی جائے پھر بھی کچھ نئی روشنی، کچھ نئی بصیرت، کچھ آگہی کے نئے پرانے پہلو ضرور چھوڑ جائے گی۔ فراق کا شعر ہے:

دکھا تو دیتی ہے بہتر حیات کے سپنے
خراب ہو کے بھی یہ زندگی خراب نہیں

فیروز اپنے وطن سے بہت دور ہیں مگر اس دوری کے باوجود نہ تو انھوں نے اپنی زمین سے قربت کا احساس ترک کیا ہے اور نہ اس کی خرابیوں اور خامیوں کو درگزر کیا ہے۔ اس اعتبار سے ان کی بالغ نظری قابل رشک ہے۔ ان کے اکثر معاصر دور دراز بسے ہوئے اہل وطن اکثر یا تو مغرب سے اس قدر مرعوب ہو جاتے ہیں کہ اس کی چمک دمک ہی میں کھو کر رہ جاتے ہیں اور وہاں کی زندگی کے درد و داغ و جستجو و آرزو تک نہیں پہنچ پاتے، یا پھر اپنے وطن کی یاد میں بے قرار ہو کر اپنے وطن کی ساری خامیوں اور کمزوریوں کو بھی بھول جاتے ہیں یا ان پر یادوں کے دل نواز پردے ڈال دیتے ہیں۔ فیروز کی کہانیوں میں یہ سب نظر نہیں آئے گا، بلکہ انسان جس طرح ان کے اپنے وطن میں آباد ہے اور انسان جس طرح مغرب میں رہتا اور بستا ہے، دونوں کے درمیان قدر مشترک کی ساری کیفیات کی آئینہ داری کی کوشش ملے گی اور پھر کسی قسم کے ذہنی یا جذباتی تحفظات کے بغیر ملے گی۔ اگر زندگی کی اس مجموعی دل دوز اجتماعیت سے (خواہ وہ فن ہی میں کیوں نہ ہو) کوئی نتیجہ نکلتا ہے تو وہی فیروز کی دریافت ہے اور میرے نزدیک اہم دریافت ہے، خصوصاً آج کل جب ہمارا افسانہ تیزی سے بھول بھلیوں میں گم ہوتا جارہا ہے۔

رہا انداز بیان، سو اول تو فیروز کو چھوٹے جملوں میں — بلکہ کبھی کبھی ادھورے جملوں میں اور کبھی کسی جملے کے بغیر ہی — کرداروں کے جذبات اور خود اپنے احساسات کو زبان دینے کا فن قابل رشک حد تک آتا ہے، دوسرے افسانے کا دراصل وہی پہلو اہم ہوتا ہے جو بن کہا یا بلا اظہار رہ گیا ہو۔ افسانہ تو محض پورے منظر کی طرف محض اشارے ہی کرتا ہے جن کی مدد سے قاری بات کو پوری طرح سجا بنا کر سمجھ سکتا ہے اور یہی تو فن ہے۔

یہ فن ان افسانوں میں اکثر جگہ پر نظر آئے گا اور اسے جان بوجھ کر دیباچے میں بھی شکست نہیں کیا گیا ہے کہ بقول شاعر:

کہا جو کچھ تو ترا حسن ہوگیا محدود

ان افسانوں کے حسن کو محدود کرنا مقصد نہیں ہے البتہ اس کی توقع ہے کہ پڑھنے والے ان کہانیوں میں زیادہ بلیغ اظہار کے وسیلوں تک پہنچیں گے اور ان میں نئی پہنائیاں دریافت کر کے جمالیاتی کیف و نشاط پائیں گے۔

محمود ہاشمی

فیروز مکرجی کے افسانوں پر ایک نظر

ہمارے ادب میں بار ہا ایسا ہوا ہے کہ کسی افسانہ نگار کا کوئی افسانہ اتنا مقبول ہوا کہ اس کے دوسرے سارے افسانے جیسے قارئین کی نظر سے اوجھل ہوگئے، اور صرف وہ ایک افسانہ ہی لکھنے والے کی پہچان بن گیا۔ غلام عباس نے ''آنندی'' لکھا تو وہ افسانہ ان کے نام کے ساتھ کچھ اس طرح چسپاں ہوا کہ لوگ ان کے دوسرے افسانوں کو نظر انداز کرنے لگے۔ سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ مدتوں تک منٹو کا افسانہ ''ٹھنڈا گوشت'' اور عصمت چغتائی کا ''لحاف'' ان کے لیے وجہ افتخار بنے رہے۔ وطن کی آزادی اور قیامِ پاکستان کے بعد البتہ یہ صورت حال ذرا بدلی، اور اب منٹو کو ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' اور عصمت چغتائی کو ''چوتھی کا جوڑا'' کی وجہ سے یاد کیا جاتا ہے۔ ممتاز مفتی کا افسانہ ''آپا'' ان کی ابتدائی کہانیوں میں سے ہے۔ اس کے بعد ان کے افسانوں کے کئی مجموعے چھپے، لیکن لوگ ممتاز مفتی کو بڑا افسانہ نگار ثابت کرنے کے لیے ''آپا'' ہی کا ذکر کرتے ہیں۔

اوپر کی سطریں لکھنے کی ضرورت اس لیے پڑی کہ لندن میں مقیم ڈاکٹر فیروز مکرجی بھی اسی طرح کی مقبولیت کا شکار ہیں: ان کے افسانے ''رعنائی خیال'' نے ان کے بیشتر پڑھنے والوں کو اس طرح مسحور کر رکھا ہے کہ وہ سمجھتے ہیں ڈاکٹر فیروز مکرجی نے بس یہی ایک افسانہ لکھا ہے اور اس کے بعد غالباً قلم توڑ دیا ہے، یا اگر قلم نہیں توڑا اور اب بھی لکھ رہی ہیں تو ان کے دوسرے افسانے ''رعنائی خیال'' کے مقابلے میں اتنے اہم نہیں ہوں گے، اور یہ کہ ''رعنائی خیال'' بس حرفِ آخر ہے۔ حالانکہ یہ بات نہیں۔ ''رعنائی خیال'' اپنے بنیادی خیال اور تکنیک کے لحاظ سے بجا طور پر اردو کے اچھے افسانوں میں سے ہے، تاہم ان کے باقی افسانے بھی یقیناً اس قابل ہیں کہ ان پر توجہ دی جائے۔

فیروز مکرجی عورتوں کی غم گسار ہیں۔ ان کے افسانے عام طور پر عورتوں کو اپنی زندگی خود بسر

کرنے کا شعور دلانے، مرد کے جبر سے نجات حاصل کرنے اور وہ حقوق واپس لینے کے موضوعات کے گرد گھومتے ہیں جو مرد نے صدیوں سے طرح طرح کے حیلوں بہانوں سے غصب کر رکھے ہیں۔ اپنے بیشتر افسانوں میں وہ کسی نہ کسی انداز میں اس حقیقت کو بے نقاب کرتی ہیں کہ کس طرح مردوں نے عورت کو ''نصف بہتر'' کی تھپکی دے کر اس کے ذہن تک پر قبضہ کر رکھا ہے، اسے نرم و نازک کہہ کہہ کر اسے یقین دلا رکھا ہے کہ وہ ایک کمزور مخلوق ہے اور زندگی کی جدوجہد میں مرد ہی اس کا سہارا ہے۔

ان کا مقبول افسانہ ''رعنائی خیال'' ان کے اسی محبوب موضوع کے گرد گھومتا ہے لیکن اس فرق کے ساتھ کہ اس میں ''نصف بہتر'' ایک حد تک اپنا مقام پا چکی ہے۔ (شاید یہی فرق لوگوں کو مزہ دے گیا!) دوسرے الفاظ میں شوہر نے اپنی بیوی کو ان پابندیوں سے آزاد کر دیا ہے جن کے جملہ حقوق شوہر عام طور پر اپنے پاس رکھتے ہیں اور ان سے دست بردار ہونا پسند نہیں کرتے۔ راج کے شوہر دیپک کا اس سے کہنا ہے کہ:

> نہ میں سنیاسی ہوں اور نہ تم سے اس کی توقع رکھتا ہوں۔ اگر اس عرصہ میں چند لمحوں کے لیے ہم کہیں سہارا لے لیں تو وہ کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ نہ میں تم سے پوچھوں گا نہ تم مجھ سے سوال کرنا۔

اور پھر جب وہ لمحوں کی ایک سازش کا شکار ہو جاتی ہے تو وہ اس طرح سوچتی ہے جس کا حق مشرق کے معاشرے نے صرف مرد کو دے رکھا ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ اپنی سوچ کا برملا اظہار بھی کرتی ہے:

> میں دیپک کی بیوی ہوں لیکن اس کی ملکیت نہیں۔ اور نہ آپ کو شرمندگی کی ضرورت ہے۔ میں اکیلی تھی، دکھی تھی، آپ ذرا میرے قریب آ گئے تو کوئی قیامت نہیں آ گئی۔ لیکن اگر آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کے قریب آنے سے میرے دل میں میرے شوہر، میرے بچوں کی محبت میں کمی آ سکتی ہے تو آپ کا خیال غلط ہے۔ ہمارا رشتہ بڑی مستحکم بنیاد پر ہے۔ میرے دل میں اتنی جگہ ہے کہ ایک چھوٹا سا کونا آپ کو بھی دے سکتی ہوں۔

''رعنائی خیال'' ہمارے بدلتے ہوئے معاشرے کی کہانی ہے جس میں مرد اور عورت میں سے کوئی کسی کا کھیل نہیں، جس میں مرد کی طرح عورت کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی زندگی کی خود مالک رہے۔ اسے جس طرح چاہے گزارے، اسے بگاڑنے اور سنوارنے کی خود ذمہ دار ہو۔

فیروز مکر جی کا ایک اور افسانہ ''صداقت حسین خان کی کہانی ان ہی کی زبانی'' ہے۔ یہ ایک ایسے مرد کی کہانی ہے جو جنسی طور پر ''صحبت ہم جنس'' کا عادی ہے۔ مغرب میں ایسے مردوں کو ''گے'' (gay) کہا جاتا ہے۔ صداقت حسین کو عورتوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ لیکن وہ محض اپنی ماں کے اصرار پر اور ماں کی خوشنودی کے لیے شادی کر لیتا ہے اور پہلی رات اپنی بیوی پر واضح کر دیتا ہے کہ ''میں آپ کو ہاتھ بھی لگانے والا نہیں ہوں۔ بس آپ یہ بتایئے کہ آپ پلنگ پر سوئیں گی یا صوفے پر؟'' اور جب دلہن خاموش رہتی ہے تو یہ سوچ کر کہ کون اس بحث میں پڑے، کمبل لے کر صوفے پر نہایت اطمینان سے سو جاتا ہے۔

ہم جنس سے جنسی لگاؤ کا موضوع ہمارے ادب میں نیا ہے۔ اس لحاظ سے اس افسانے کی بڑی اہمیت ہے۔ افسانہ میں فیروز مکر جی نے اپنے ہیرو صداقت حسین خان کی بیوی کا جو کردار پیش کیا ہے، وہ بھی ایک عام عورت کا نہیں۔ شادی ہونے تک تو وہ شاید ایک عام عورت ہی تھی، لیکن شادی کے بعد صداقت حسین خان کے رویے کے اوّلین صدمے پر قابو پانے کے بعد وہ ایک حقیقت پسند اور توانا شخصیت کے طور پر ہمارے سامنے آتی ہے۔ اب وہ بیسویں صدی کے مشرقی معاشرے کی ایک بے بس اور مظلوم عورت نہیں رہتی بلکہ کچھ اس طرح کا احساس دلاتی ہے جیسے وہ آنے والے دور کی دھندلی نہیں بلکہ واضح تصویر ہو — اکیسویں صدی کی عورت ہو۔

فیروز مکر جی کے افسانے عورتوں کے دکھوں کے افسانے ہیں۔ ان میں مرد کے ہاتھوں عورت کے استحصال کے کئی روپ ہیں۔ اس استحصال میں عورت خود بھی مرد کا حوصلہ بڑھاتی ہے۔ کبھی عورت عورت ہی کی دشمن ہے۔ انتہا یہ ہے کہ بعض اوقات بیٹا بھی اس کا استحصال کرنے والوں میں شامل ہوتا ہے۔ اور یہ سب کچھ زمانے کا دستور بن کر جیسے معاشرے کا ایک معمول ہے۔ اس ضمن میں افسانہ ''تلاش میں'' ایک فکر انگیز مثال ہے۔ تاہم یہ کہنا کہ فیروز مکر جی صرف اسی ایک موضوع کی افسانہ نگار ہیں، غلط ہوگا۔ ان کے موضوعات محدود نہیں ہیں۔ ''ورثہ'' میں فسادات کا المیہ اور ''یادیں'' اور ''التجا'' جیسے افسانوں میں انسانی جذبات کے وہ رخ ہیں جنہیں پڑھتے ہوئے بقول شاعر ''چوٹ پڑتی ہے رگ جاں پر۔''

''مولسری کے پھول'' اور ''پرانا گھر نئے باسی'' ان لوگوں کے بارے میں ہیں جنہوں نے اپنا وطن چھوڑا، سات سمندر پار کیے، برطانیہ اور امریکہ میں نئی بستیاں بسائیں اور اپنے ایک مسئلے —

اقتصادی مسئلے — کوحل کرتے کرتے اپنے لیے کئی نئے مسائل پیدا کر لیے۔ ''مولسری کے پھول'' ایک بچے کی کہانی ہے جسے اس کے والدین نانی کے پاس وطن عزیز میں چھوڑ آئے ہیں۔ نئے دیس میں گھر بسانے کی ابتدائی جدوجہد کے بعد وہ اسے اپنے پاس لاتے ہیں تو بچہ، جس کی عمر اب پانچ سال ہو چکی ہے، ذہنی انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔ اب تک وہ نانی کو اپنی ماں سمجھتا رہا ہے۔ اس کی اصلی ماں اب اس کے لیے اجنبی ہے۔ اکثر تارکین وطن ماؤں کا یہ المیہ ہے کہ وہ اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو اپنے سے دور رکھ کر سمجھتی ہیں کہ وہ صرف اپنی ممتا کی قربانی دے رہی ہیں اور یہ نہیں سمجھتیں کہ اصل قربانی اس بچے کی ہو رہی ہے جسے اس کی عمر کے ابتدائی سالوں میں، جو اس کی جذباتی نشوونما کے لیے انتہائی اہم تھے، والدین بالخصوص ماں کی محبت سے محروم کر کے اس کی شخصیت کی بنیادوں کو ہلا کر، اس کی زندگی میں ایک ایسا خلا پیدا کر دیا گیا ہے جو ساری عمر پُر نہیں ہو سکے گا اور زندگی کے ہر قدم پر اس کی راہ کا روڑا بنا رہے گا۔

''پرانا گھر نئے باسی'' اس اتھل پتھل کی کہانی ہے جو ہمارے معاشرے میں پاکستان کے قیام اور آزادی کے بعد پیدا ہوئی۔ لوگوں نے اپنے پرانے آبائی گھر چھوڑ کر نئے ملک پاکستان میں آبسیرا کیا۔ ایک گھر چھوٹا تو ساری دنیا اپنا گھر نظر آنے لگی۔ پاؤں کی زنجیریں ٹوٹ گئیں، سمندر پار ملکوں کی راہیں آسان ہوئیں، اور پاؤں کے چکّر میں گرفتار خلقِ خدا تلاش رزق میں دور دور گھر بسانے لگی۔ ''پرانا گھر نئے باسی'' اسی صورت حال کی ایک تصویر ہے۔ پرانا گھر ہندوستان کے شہر لکھنؤ میں ہے۔ کبھی اس میں ایک پورا کنبہ آباد تھا لیکن اب یہاں صرف دو بوڑھی بیوہ بہنیں رہتی ہیں۔ ایک بیٹا تھا جو پاکستان میں کسی بڑے عہدے پر فائز ہے۔ ایک بیٹی بمبئی میں بیاہی ہے۔ دوسری بیٹی افسانے کی ہیروئن عابدہ ہے جو شادی کے بعد امریکہ چلی گئی ہے اور وہیں کی شہریت اختیار کر لی ہے۔ دور کے ایک رشتہ دار فیض علی جائیداد کی دیکھ بھال کرنے اس گھر میں آگئے ہیں۔ اور ایک پرانے خاندانی ملازم کی پوتی زینب نے اس گھر میں نواسیوں اور پوتیوں کی جگہ لے رکھی ہے۔

عابدہ امریکہ سے آئی تو اس کی زینب سے بھی ملاقات ہوئی۔ ''ہاں بی بی، وہاں گاؤں میں اردو نہیں پڑھائی جاتی۔ اس لیے نانی بیگم مجھے اپنے ہی پاس رکھ کر پڑھوائیں گی۔ میرا داخلہ بھی ہو گیا ہے۔ میں سائنس پڑھوں گی۔''

اور جب عابدہ نے سوال کیا، ''سائنس کیوں پڑھے گی؟'' تو اس نے جواب

دیا۔ ''میں انجینئر بنوں گی بی بی۔''

عابدہ کو بیوہ ماں، خالہ اور رشتہ داروں کی محبت کے علاوہ جوانی کی رومان انگیز یادیں امریکہ سے لکھنؤ کھینچ لاتی ہیں۔ اس کی دو بیٹیاں بھی اس کے ساتھ آتی ہیں۔ یہ دونوں رنگ و نسل کے لحاظ سے تو ہندوستانی ہیں لیکن زبان، کلچر اور خیالات کے اعتبار سے ان میں اور امریکن لڑکیوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ لوگ پانچ چھ سال بعد جب ہندوستان آتے ہیں تو ''تسلیمات نانی اماں''، ''آداب عرض خالہ جان'' وغیرہ کے بعد ان کی اردو ختم ہو جاتی ہے، اور عابدہ کی ماں بڑی نرمی سے بیٹی سے شکایت کرتی ہیں۔ ''اے عابدہ، تو نے بچیوں کو اپنی زبان کے دو لفظ بھی نہیں سکھائے جو میں اپنی نواسیوں سے ذرا دل کھول کر باتیں کر سکوں۔'' پھر نواسیوں سے کہتی ہیں، ''ذرا آہستہ بولو۔ میں انگریزی جانتی ہوں لیکن یہ امریکن انگلش سیکھنے میں وقت لگے گا۔ خیر۔ جب لال پیارے تو ان کے کھیل بھی پیارے، ان کی زبان بھی پیاری....''

یہ افسانہ جو اس صدی کے آخر میں لکھا گیا ہے، ایک لحاظ سے نئی صدی کا مرغِ بادنما ہے جس کا رخ ان پرانے مکانوں کی طرف ہے جن کے باسی ان میں نسل در نسل رہنے کے بعد وہاں سے رخصت ہو رہے ہیں۔ پرانے گھر اور پرانے ہو کر گر رہے ہیں۔ معاشرہ بھی پرانا ہو کر ریزہ ریزہ ہو رہا ہے۔ اس میں اپنے آپ کو سمونے کے لیے نئی اقدار اُبھر رہی ہیں۔ پرانی اقدار میں اب کوئی جان نہیں رہی۔ پرانی بنیادوں پر ایک نئی تعمیر ہو رہی ہے۔ زمین وہی پرانی ہے لیکن اس کا باسی نیا ہے۔ یہ نئی بنت حوا اور نیا ابن آدم ہے، یا نئے زمانے کی بنت آدم اور ابن حوا ہے۔ ترکیبیں بدل رہی ہیں۔ الفاظ کی حدود ٹوٹ رہی ہیں۔

افسانہ نگار ڈاکٹر فیروز مکر جی لندن میں مقیم اردو افسانہ نگاروں میں ایک خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ اردو کے علاوہ وہ انگریزی میں بھی لکھتی ہیں اور انھوں نے افسانوں کے علاوہ ''لکھنؤ اور سرشار کی دنیا'' جیسی تحقیقی کتاب بھی لکھی ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ اردو میں بھی ہو چکا ہے۔ تحقیق و افسانہ کے ساتھ ساتھ وہ لندن کے ایک روزنامہ ''آواز'' میں کچھ عرصہ کالم بھی لکھتی رہی ہیں جو بڑی دلچسپی سے پڑھے جاتے تھے۔ ایک زمانے میں انھوں نے لندن سے ایک رسالہ ''جنبش نو'' بھی جاری کیا تھا جس کی پیشانی پر ''خواتین کا ادبی شمارہ'' لکھا ہوتا تھا۔ اس کا عصمت چغتائی نمبر خاص طور پر بہت مقبول ہوا تھا۔

کنول نین پرواز

فیروز مکرجی

کل اور آج کے ادبی تناظر میں

"اپنے وطن میں سبھی کچھ ہے پیارے"

برسوں پہلے کسی نے یہ بات کہی تھی — اُس وقت جب ہندوستان ہندوستان ہی تھا، بھارت اور پاکستان نہیں — لیکن ملک کی تقسیم کے باوجود اگر یہ بات ادبی تناظر کے حوالے سے کہی گئی تھی تو برصغیر کے بارے میں یہ مقولہ آج بھی صادق آتا ہے۔

تقریباً پچھلے پچاس برسوں میں، ہجرت کے کسی طلسم کے زیر اثر برصغیر سے آنے والے لوگوں کی جوفوجوں کی فوجیں یہاں برطانیہ میں آباد ہوئی ہیں ان میں شعر و ادب سے رغبت رکھنے والوں کی بھی ایک خاصی تعداد کے پیش نظر اب برطانیہ کو اردو کا تیسرا بڑا مرکز تصور کیا جانے لگا ہے، اور "سبھی کچھ" ڈھونڈنے کے لیے، برصغیر کی طرف ہی اب نظریں دوڑانے کی زیادہ ضرورت نہیں پڑتی۔

۱۹۴۹ء کے لگ بھگ جب میں خود برطانیہ پہلی بار آیا تھا تو دور دراز کے علاقے تو جانے دیجیے، لندن جیسے بڑے شہر کے مرکزی بازار یا کسی گلی کوچے میں برصغیر کی کوئی جانی پہچانی صورت مشکل سے ہی نظر آتی تھی اور اگر اتفاق سے اپنا کوئی ہم وطن کہیں نظر آ گیا تو سلام دعا کے بعد اس سے بغل گیر ہونے کو بھی جی چاہتا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہاں کے ریستورانوں میں جب تنور لگنا شروع ہوئے اور تندوری چکن اور نان اور دوسرے ہندوستانی اور پاکستانی طعام کی خوشبو یہاں کے گلی بازاروں میں پھیلنے لگی تو دیکھتے ہی دیکھتے جگہ جگہ ادبی تنظیموں کے قیام سے شعر و شاعری کے رنگ دبو کی مہک بھی

اس میں شامل ہونے لگی۔

دوسری جنگ عظیم کے آغاز کے وقت برصغیر کی چند جانی پہچانی جو شخصیتیں لندن میں قیام پذیر تھیں ان کی ذاتی اور نیم ذاتی محفلوں میں ادب وفن کی جو سرگوشیاں سنائی دیتی تھیں، انہیں کسی ادبی تناظر سے تو موسوم نہیں کیا جاسکتا، لیکن یہ سید سجاد ظہیر، ڈاکٹر ملک راج آنند اور ڈاکٹر محمد اشرف جیسے لوگوں کی کوششوں کا نتیجہ ہی تھا کہ ہندوستان لوٹنے پر، ۱۹۳۶ء میں جس ترقی پسند تحریک کا احیا ہوا وہ ایک ایسا ادبی دھماکا تھا کہ اس کی گونج آنے والی دہائیوں میں دور دور تک سنائی دیتی رہی۔ اس کل ہند ترقی پسند کانفرنس کے بعد برصغیر میں جگہ جگہ ترقی پسند انجمنیں قائم ہوئیں۔

ہمارے ادب کی اس تحریک میں لکھنے والوں نے جس جوش وخروش سے شرکت کی وہ اب ہماری تاریخ کا ایک اہم حصہ بن چکا ہے، اور اس دور کی تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ اس کے ہراول دستے کے سالاروں میں سجاد ظہیر، ملک راج آنند، اپریم چند اور حسرت موہانی جیسے اول درجے کے دانشور تو تھے ہی لیکن اس صدی کی پانچویں دہائی تک اس تحریک کے دوسرے ''سپاہی'' بھی ایک اہم رتبے پر پہنچ چکے تھے —اس دہائی کو ہمارے اردو ادب کا نشأۃ الثانیہ (Renaissance) تصور کیا جاتا ہے۔

لکھنے والی خواتین کو اس راہ پر گامزن ہونے میں کچھ دیر لگی، لیکن جب ڈاکٹر رشید جہاں جیسی خواتین نے افسانہ نگاری کے میدان میں قدم رکھا تو مردوں کے اس بھرے بازار میں، انہیں شاید اکیلے پن کا احساس بھی ہوا ہوگا لیکن دیکھتے ہی دیکھتے خواتین افسانہ نگاروں کی ایک فوج ان کے پیچھے ہوئی تو وہ خود افسانہ نگاری کے میدان میں ایک سالار بھی بن گئیں۔ آج بھی انہیں خواتین افسانہ نگاروں کا ایک امام سمجھا جاتا ہے۔

ڈاکٹر فیروز مکرجی کے افسانوں اور ان کی زندگی کے بارے میں کچھ لکھنے کے لیے اس تمہید کی ضرورت اس لیے پڑی کہ برطانیہ میں، ساتویں دہائی کے وسط تک، جو ادبی تناظر قائم ہو چکا تھا اس میں زیادہ تر مرد لکھنے والے ہی نظر آتے تھے اور اس میں شرکت کرنے والی خواتین افسانہ نگاروں کو دوسرے یا تیسرے درجے پر ہی رکھا گیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ بھی ہے کہ صدیوں سے عورتوں کے بارے میں ہمارے سماج اور معاشرے کا یہ رویہ رہا ہے کہ مرد کی نصف بہتر ہونے کے باوجود ان کی ''تخلیقی صلاحیتوں'' کو صرف گھر بنانے سنوارنے، طعام پکانے اور بچے جننے تک ہی محدود رکھا جائے۔ یہاں بسنے والی خواتین کو ایک نئے معاشرے کے تقاضوں کے بوجھ کو کندھوں پر سنبھالنے کے ساتھ

ساتھ اپنے وطن سے دوری کے کرب اور اعزہ وا قارب سے بچھڑنے کے کرب کو برداشت کرنے کے لیے بھی ایک نیا ہنر سیکھنا پڑا۔ اور غالباً اس عذاب بے زبانی کو منظر عام پر لانے کے لیے جن خواتین نے پہل کی ان میں فیروز مکرجی کا نام سب سے آگے آگے ہے۔

لکھنؤ کے قریب جنم لینے والی اس خاتون نے ملک کی تقسیم سے پہلے جب لکھنؤ اور علیگڑھ سے اپنی تعلیم ختم کی تو پاکستان بننے کے فوراً بعد کراچی جانے کا فیصلہ کیا۔ اس میں ملک سے ہجرت کرنے کا کوئی دخل نہیں تھا۔ وہ پاکستان جرنلزم کرنے کے لیے گئی تھیں، اور کچھ عرصہ وہاں ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' اور ''ڈان'' میں لکھتی رہیں، لیکن کچھ عرصے بعد ہی ہندوستان واپس لوٹ آئیں۔ لکھنؤ میں کچھ عرصہ ''پائنیر'' میں کام کرنے کے بعد انھوں نے بالآخر برطانیہ آنے کا فیصلہ کیا۔ ان کی افسانہ نگاری کا آغاز کالج کے زمانے سے ہی ہو چکا تھا۔ لکھنؤ میں پروفیسر احتشام حسین جیسے ممتاز نقاد اور ادیب ان کے استاد تھے۔ ڈاکٹر محمد حسن کالج میں ان کے کلیگ تھے جن سے آج تک ان کے مراسم قائم ہیں۔

کہتے ہیں زندگی کے اکثر اتفاقات چونکا دینے والے ہوتے ہیں۔ خود میری جب فیروز مکرجی سے ۱۹۸۹ء میں برطانیہ میں ڈاکٹر محمد حسن کے توسط سے ہی پہلی ملاقات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ جس زمانے میں یعنی ۱۹۴۵ء کے قریب میں نے شاہد احمد دہلوی کے ماہنامہ ''ساقی'' (دہلی) میں لکھنا شروع کیا تو وہ بھی ان دنوں اس رسالے میں ''عائشہ'' کے نام سے افسانے لکھ رہی تھیں۔

اپنے وطن کی یاد انھیں پاکستان سے ہندوستان واپس لے ہی گئی لیکن ۱۹۶۸ء کے قریب برطانیہ آنے پر اور یہاں مستقل طور پر بسنے کے بعد، لکھنؤ بار بار جانا اتنا آسان کام نہیں تھا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ اپنے وطن لکھنؤ کی تہذیب اور کلچر کا جو خمیر ان کی شخصیت میں رچ بس گیا ہے، اسے شعوری یا غیر شعوری طور پر انھوں نے اپنی ڈاکٹریٹ کی تھیس کا مرکز بنا کر ''لکھنؤ اور سرشار کی دنیا'' لکھی۔ اور انگریزی میں کراچی کے سعد پبلیکیشنز نے تو اسے شائع کیا ہی ہے، لیکن جامعہ ملیہ کے سہ ماہی رسالے ''جامعہ'' میں بھی اس کی چند قسطیں اردو میں شائع ہو چکی ہیں۔ اور اب اس کا مکمل اردو ترجمہ بھی کراچی سے آج کی کتابیں کے زیر اہتمام شائع ہو گیا ہے۔ ادبی تنظیم اردو سنٹر کے جنرل سکریٹری مجاہد ترمذی نے اس انگریزی کتاب کی رسم رونمائی منعقد کی اور یہ تقریب یہاں کے ادبی تناظر میں ایک خاص اہمیت کی حامل ہے۔

برطانیہ آنے کے بعد ذاتی سطح پر شادی، ایک بچے کی پیدائش اور اسکول میں پڑھانے کے

ساتھ ساتھ، ازدواجی زندگی کی ان گنت ذمہ داریوں کو سنبھالتے ہوئے اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے سنیاس نہ لینا بھی ایک معرکے کی بات ہے۔ اور اس طویل خاموشی کے بعد جب انھوں نے پھر ادب کے میدان میں قدم رکھا تو افسانے لکھنے کے ساتھ ساتھ خواتین کے ایک رسالے ''جنبشِ نو'' کی بنیاد بھی ڈالی۔ جس افسانہ نگار عائشہ کو انھوں نے برطانیہ آنے پر تیاگ دے دیا تھا وہ اب اپنے اصلی نام سے ایک مدیر اور چند ادبی انجمنوں کے سربراہ کے روپ میں نمودار ہوئی۔ اس عرصے میں وہ ''اردو ہندی اکیڈمی''، فیض اکیڈمی اور ''آزادیِ فکر و خیال کے فورم'' کی صدر بھی رہ چکی ہیں۔ ادب کے میدان میں اس سب بھاگ دوڑ کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ ان کی اصل شناخت ایک افسانہ نگار کی ہی ہے۔

ترقی پسند تحریک نے لکھنے والوں کے لیے نئے راستوں کا تعین کیا، اور اس میں شک نہیں کہ اس کی بنیاد رکھنے والوں میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جن کا اشتراکی فلسفے میں ہی اعتقاد تھا اور اس دور کے اکثر لکھنے والوں نے بھی اشتراکیت کو اپنا رہبر بنا کر اس راستے پر قدم اٹھائے۔ اور ایسا ہونا ایک قدرتی امر بھی تھا اور تیسری دنیا (Third World) میں بڑھتی ہوئی غربت اور بیکاری اور دوسری طرف یورپ میں ہٹلر اور مسولینی کا فاشزم دوسری جنگِ عظیم کے دوران روسی فوجوں اور عوام نے جس قوت اور عزم کے ساتھ اس کو شکست دینے میں جو لاتعداد جانی قربانیاں دیں اس کی تاریخ لکھنے میں وہاں کا ادب ہی پیش پیش ہے۔ جنگ کے آغاز سے پہلے بھی جس ادب کی روس میں تخلیق ہو رہی تھی اس سے دنیا بھر کے ادیب بے حد متاثر ہو رہے تھے۔ روس کے اس نئے ادب میں بھی اس نئے انسان کی عظمت کی جو جھنکار سنائی دے رہی تھی اس سے آنکھیں بند کر لینا حقیقت سے انحراف کے برابر ہوتا۔

اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو ادب کی پانچویں دہائی کے سنہری دور کے بعد اس میں انتشار پھیلنا شروع ہو گیا تھا، اور جہاں جہاں اس میں نئے لکھنے والوں کو کچھ دراڑ نظر آئے، انھوں نے نئے نئے رجحانات سے اسے پر کرنے کی کوشش کی۔ علامیت، مزاحمیت، تجریدیت، یہ سب کچھ ادب کے ارتقا کا ایک اہم پہلو ہے۔ لیکن چند نئے لکھنے والوں نے ترقی پسندی سے انحراف کرتے ہوئے ان نئے رجحانات کو ایک تحریک سمجھ کر ان کی پیروی کی اور اس دور کے چند نقادوں نے ترقی پسندی کا جنازہ نکالتے ہوئے علامیت، مزاحمیت اور تجریدیت وغیرہ وغیرہ کا سہارا لیتے ہوئے

صف بہ صف کھڑے ہوکر ایسے لکھنے والوں کی عظمت کو بڑھاوا دیتے ہوئے اس بات کونظر انداز کر دیا کہ آگے بڑھتا ہوا ادب ان رجحانات کو بھی اندر آنے کی اتنی ہی اجازت دیتا ہے جو وقت کے تقاضے کی کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔

ترقی پسندی میں آپ کا اعتقاد ہو یا نہ ہولیکن ہر اچھا لکھنے والا اپنے ضمیر کی آواز سننے کے ساتھ ساتھ اپنے ماحول پر بھی نظر ڈالتا ہے۔ اور اگر اس کی تخلیق شہ پارہ کے زینے تک پہنچنا چاہتی ہے، تو اسے ادب کے دوسرے اہم لوازمات، زبان و بیان کی شگفتگی، فن کے تنوع اور جمالیات کو بھی اپنے اندر سمیٹنا پڑتا ہے۔ معاشرے کی ناہمواریوں کے خلاف، ادب میں نعرے لگانا ضروری نہیں ہے لیکن جو ادب زندگی کے ہر پہلو کی دھڑکنیں سننے سے خود کو محروم رکھتا ہے اسے کوئی دوام حاصل نہیں ہوسکتا۔

اور ان دنوں بھی کچھ عرصے سے جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے حوالے سے ادبی مباحثوں کی گرم بازاری میں جو پکوان پک رہے ہیں، اس سے شاید چند نقادوں کو کچھ ذہنی آسودگی حاصل ہوتی ہوگی لیکن اکثر دوسرے افسانہ نگاروں کی طرح فیروز مکر جی اس بات پر نادم نہیں کہ کوئی ہماری کہانی اغوا کر کے لے گیا تھا اور کہانی پھر ایک Prodigal child کی طرح واپس آگئی ہے۔ زیب داستان کے لیے یہ نقاد خود کو ہر طرح کی خوش فہمی میں مبتلا کرلیں تو اس میں افسانہ نگار کا کوئی قصور نہیں۔ اگر فیروز مکر جی جیسے افسانہ نگار کو کوئی ادبی دکھ ہے تو وہ یہ کہ وہ اتنے عرصے میں دیار ادب سے روپوش رہیں۔

اس طویل خاموشی کے باوجود انھوں نے دو درجن سے اوپر کہانیاں لکھ ڈالی ہیں۔ ''تلاش میں''، ''انمول ورثہ''، ''یادیں''، ''التجا''، ''مولسری کے پھول''، ''پرانا گھر نئے باسی''، ''رعنائی خیال'' آج کے وہ افسانے ہیں جن میں ماضی کی دھڑکنیں بھی سنائی دیتی ہیں اور اپنے وطن کے معاشرے اور سماج کے مسائل کا احاطہ کرتے ہوئے جب ان کا افسانوی فن سات سمندر پار چھلانگ لگاتا ہے تو اس نئے وطن میں بھی وہ اس زندگی کے تانے بانے بنتی ہیں جسے انھوں نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔

ان کے افسانے ''صداقت حسین خاں کی کہانی خود ان کی زبانی'' میں انھوں نے کسی علامت کا سہارا نہیں لیا بلکہ ایک gay انسان کی ازدواجی زندگی کی کشمکش کو خوش اسلوبی کے ساتھ بڑے صاف گو اور کھلے انداز میں بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں، ہر اچھی کہانی میں کوئی نہ کوئی ایسا پہلو بھی ہوتا ہے، جسے پڑھنے والا اپنی زندگی سے Identify کرتا ہے۔ ان کی کہانی ''انمول ورثہ'' پڑھتے ہوئے اس

کے مرکزی کردار کشن سنگھ کے بچپن کا وہ واقعہ جب ان کا خاندانی ملازم کموخان اپنے کندھے پر ڈالے ادھر ادھر گھما رہا تھا، خود مجھے اپنے بچپن کے وہ دن یاد آ گئے جب ٹیکسلا کے ریلوے اسٹیشن پر، جہاں میرے والد اسٹیشن ماسٹر تھے، وہاں کا ایک ملازم شعبان خان مجھے اپنے کندھوں پر بٹھائے دن بھر سارے شہر میں گھومتا پھرتا تھا۔ کشن سنگھ اور کموخان کا یہ قریبی رشتہ فیروز مکر جی کے سکیولرازم کی علامت بھی بن جاتا ہے۔ یاد رہے کہ لکھنؤ کی اس مسلمان خاتون نے برطانیہ آنے پر ایک بنگالی ہندو سے شادی کی۔ اس ذاتی رشتے میں بھی ان کی لکھنؤ کی گنگا جمنی تہذیب کی قدروں، رشتوں اور رواداریوں کا ایک ایسا دریا بہتا نظر آتا ہے جو ان کی اکثر کہانیوں میں ٹھاٹھیں مارتا دکھائی دیتا ہے۔ ان کے اس فکری اور اعتقاد میں بغاوت کا ایک عزم بھی ہے، اس سماج اور معاشرے کے خلاف جو انسانی رشتوں کو مختلف ڈبوں میں بند کر کے اس پر مذہب کا لیبل لگا دیتا ہے۔

اپنے وطن سے دور بسنے والے ادیبوں اور شاعروں کی ادبی زندگی کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ اچھا ادب تخلیق کرتے ہوئے بھی انہیں وہ پروجیکشن نہیں ملتی جو برصغیر کے وسیع کلچرل کینوس میں میسر ہو سکتی ہے۔ ادب کے دھارے کے ساتھ ساتھ بہنے کے لیے اپنے ملک میں ریڈیو، ٹی وی اور رسالوں کی جو اعانت میسر ہے اس سے ہم یہاں لکھنے والے پوری طرح سے مستفید نہیں ہو سکتے۔ اور یہ بھی سنی سنائی نہیں، بلکہ لکھی لکھائی بات ہے کہ حال ہی میں پاکستان کے ایک نقاد نے یہ بات بھی کہہ ڈالی کہ برصغیر سے باہر لکھا جانے والا ادب محض ضمنی ہے۔

اس کے باوجود فیروز مکر جی جیسے افسانہ نگاروں نے وطن سے دور رہ کر بھی اپنے افسانوں میں فکر اور بیان کی جو جاذبیت اور توانائی پیدا کی ہے اس کی افادیت کو تسلیم کرنے میں کل کے مورخ کو کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوگی۔

انمول ورثہ

کشن سنگھ نے جب سے ہوش سنبھالا تھا کمو خاں کو دیکھا تھا۔ کمو خاں کی محبت، ان کی نگہداشت اور ان کے ساتھ گزارے ہوئے دنوں کی یادیں بڑی خوشگوار تھیں۔ اس زمانے میں بچوں کو پرانے نوکروں کو صرف ان کا نام لے کر پکارنے کی اجازت نہیں تھی۔ انہیں کسی نہ کسی رشتے سے مخاطب کیا جاتا تھا۔ انھوں نے کمو خاں کو ہمیشہ ''کمومما'' کہہ کر پکارا تھا۔ اس وقت انہیں یہ بھی تمیز نہیں تھی کہ وہ ان کے ملازم تھے یا ان کے ماموں۔ انھوں نے اپنی والدہ کو بھی انہیں ''کمو بھیا'' ہی کہتے سنا تھا۔ بعد کو انہیں معلوم ہوا کہ وہ اس گاؤں سے ان کے یہاں کام کرنے آئے تھے جہاں ان کی والدہ کی پیدائش ہوئی تھی۔ اس زمانے میں وہ تو صرف یہ جانتے تھے کہ روز صبح کمو خاں سبزیوں اور پھلوں کی بڑی خوبصورت ٹوکری ان کے والدین کے باغ سے لے کر آتے تھے۔ بچپن کی یادوں کے ساتھ وہ ٹوکری بھی ان کی آنکھوں میں پھر جاتی تھی جس میں طرح طرح کی سبزیاں سجا کر سب سے اوپر کوئی نہ کوئی پھل رکھا ہوتا۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی وہ آواز دیتے، ''کشن بیٹا! آؤ دیکھو میں تمہارے لیے کیا لایا ہوں۔'' اس وقت ان کی عمر تین چار سال کی ہوگی لیکن انہیں اب تک یاد تھا کہ وہ سارے کھیل چھوڑ کر ڈیوڑھی کی طرف بھاگتے جہاں کمو خاں سر پر ٹوکری رکھے کھڑے ہوتے۔ کمو خاں کی آواز سن کر ان کی ماں کہتیں، ''آؤ بھیا اندر آجاؤ۔ دیکھوں تو کیا کیا لائے ہو۔'' اور کمو خاں ٹوکری ان کے پاس رکھ دیتے، لیکن کشن سنگھ کے لیے سبز پتوں میں سجا ہوا پھل لے کر اپنے پاس رکھ لیتے اور جب کشن ان کی گود میں آکر بیٹھ جاتے تو بڑے پیار سے وہ پھل انہیں دے دیتے۔ ان کی ماں کمو خاں سے شکایت کرتیں، ''تمہارا لایا ہوا پھل تو کھالیتا ہے لیکن اس کے بعد دن بھر کچھ نہیں کھانا چاہتا۔ دیکھو تو کیسا دبلا ہے۔'' کمو خاں کہتے، ''ابھی تو بچہ ہے بیٹا جب بڑا ہوگا تو سمجھ آجائے گی۔'' پھر ان کی ماں کی توجہ ٹوکری کی طرف چلی جاتی۔ انہیں دیکھ کر وہ ایسی خوش ہوجاتیں جیسے وہ سبزیاں ان کے باغ سے نہیں آئیں بلکہ کمو خاں نے خاص طور پر ان کے لیے ہی اگائی ہیں۔ وہ اس قسم کا کوئی جملہ کہتیں، ''بزار والی سبزیوں میں یہ بات کہاں۔ تمھاری لائی ہوئی سبزیوں کی بات ہی اور ہے۔'' اور پھر وہ

رسوئیے (باورچی) کو بلا کر ہدایتیں دیتیں کہ کون سی سبزی کب بنے گی اور خود بھی سبزیاں کاٹنے بیٹھ جاتیں۔

روزانہ کے اس کام کو انجام دیتے ہوئے ان کے دل کا سکون ان کے چہرے پر چمک اٹھتا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لوگ اب تک معصوم ہی تھے۔ فرج، فریزر، ٹیلی وژن حاصل کرنا زندگی کا مقصد نہیں بن گیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں اب بھی جاذبیت تھی۔ عزیزوں اور دوستوں سے اب تک رشتے تنگ نہیں ہوئے تھے۔ اسی لیے کشن سنگھ کی شخصیت اور ان کے خیالات کی جو داغ بیل اسی زمانے میں پڑ گئی تھی اس میں کموخاں کی یادیں بھی اجاگر تھیں۔ انہیں یاد تھا کہ جب وہ کموخاں کے ساتھ باغ جاتے ہوئے کبھی تھک جاتے تو وہ انہیں اٹھا کر اپنے کندھوں پر بٹھا لیتے اور انہیں محسوس ہوتا کہ وہ بہت قد آور ہو گئے ہیں اور اگر چاہیں تو ہاتھ اٹھا کر آسمان چھو سکتے ہیں۔ چاندنی راتوں میں وہ کموخاں کے کندھوں پر بیٹھ کر سوچتے کہ کمومما ہی نہیں چندا ماموں بھی ان کے ساتھ چل رہے ہیں۔

جب ذرا بڑے ہوئے تو انہیں اپنی اور کموخاں کی زندگی کے فرق کا احساس ہوا۔ اب وہ یہ بھی جانتے تھے کہ کموخاں ان کے ماموں نہیں بلکہ ان کے باغ میں مالی ہیں۔ ان کے نیچے دو اور مالی تھے جو ان کی عزت کرتے تھے۔ والد بھی اسی طرح برتاؤ کرتے تھے جیسے عزیزوں اور رشتہ داروں سے کرتے تھے اس لیے ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کموخاں کی زندگی اتنی مختلف کیوں تھی، ان کا چھوٹا سا گھر اس قدر سونا کیوں تھا۔ باغ کے کونے میں دوسرے نوکروں کے بھی کوارٹرس سے الگ ایک کشادہ سا کمرہ، اس کے آگے ایک برآمدہ تھا جہاں کموخاں خود ہی کھانا پکاتے تھے۔ اس ساری دنیا میں وہ بالکل اکیلے تھے۔ اگر ان کا کوئی خاندان تھا، کسی سے کوئی ان کا رشتہ تھا تو وہ ان کے ہی خاندان سے تھا۔ ایک دن انھوں نے اپنے والد سے پوچھا، ''بابو جی، کمومما کا کوئی بیٹا نہیں ہے۔ کیا وہ بالکل اکیلے ہیں؟'' ان کے والد نے ہنس کر پوچھا، ''تمھیں یہ فکر کیوں پڑ گئی؟'' انھوں نے جواب دیا، ''ان کا کوئی بیٹا ہوتا تو ہم باغ میں اس کے ساتھ کھیلتے۔'' تین لڑکیوں میں وہ اکیلے ہی لڑکے تھے اور بڑھ کر انہیں اپنے ہم جنس ساتھی کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ بہنوں کے ساتھ گڑیا گڈے کے کھیلوں میں دلچسپی کم ہوتی جا رہی تھی اور تینوں بہنوں کی محبت اور شفقت کے باوجود وہ کبھی کبھی اپنے آپ کو اکیلا محسوس کرنے لگے تھے۔ ''بابو جی، ان کے گھر میں تو کوئی نہیں رہتا۔ کیا وہ بالکل اکیلے ہیں؟ ایک بھی بیٹا نہیں ہے ان کا؟''

''ہے کیوں نہیں،'' ان کے والد نے جواب دیا۔

''تو کہاں ہے؟''

''یہ تو تم ان سے ہی پوچھو۔''

اور موقع ملتے ہی انھوں نے کمو خاں سے پوچھا، ''کمو مما تمہارا بیٹا کہاں ہے؟''

کمو خاں کھرپی لیے سبزی کی کیاری کی نلائی کرر ہے تھے۔ ان کا ہاتھ ایک دم رک گیا، لیکن انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور پھر اور بھی تیزی سے نلائی شروع کر دی۔ انھوں نے پھر سوال کیا۔ مگر کمو خاں اسی طرح خاموشی سے کام کرتے رہے جیسے انھوں نے سوال سنا ہی نہیں۔

وہ جانتے تھے کہ بڑے جب بچوں کی کسی بات کا جواب نہیں دینا چاہتے تو خاموش ہی رہتے ہیں، اس لیے انھوں نے دوبارہ سوال نہیں دہرایا۔ لیکن ہوش سنبھالنے پر انہیں کسی نے بتایا کہ کمو خاں ہمیشہ ہی اکیلے نہیں تھے۔ ایک دن وہ اپنی نئی نویلی بیوی کو لے کر گاؤں سے آئے تھے اور ان کا سونا سونا گھر آباد ہو گیا تھا۔ گاؤں سے بھی ان کے رشتہ داروں کی آمدورفت بڑھ گئی تھی۔ ان کا چھوٹا بھائی آیا ہوا تھا۔ ایک دن وہ حسب معمول کھانا کھانے گھر گئے لیکن بڑی جلدی ہی باہر نکل کر دو دن کے لیے غائب ہو گئے۔ ان کے چہرے پر وحشت چھائی ہوئی تھی۔ دو دن بعد جب وہ واپس لوٹے تو ان کا بھائی گاؤں جا چکا تھا۔ بجائے اپنے کمرے میں جانے کے وہ سیدھے ان کے والد کے پاس گئے۔ نہ جانے ان دونوں میں کیا باتیں ہوئیں لیکن کچھ دیر بعد اکّے میں بٹھا کر ان کی بیوی کو ایک نوکر کے ساتھ ان کے مائکے بھیج دیا گیا اور اس کے بعد نہ کبھی وہ واپس آئیں اور نہ کمو خاں اپنے گاؤں گئے۔ نہ جانے کیسا زخم انھوں نے کھایا۔ وہ تو اپنے خاندان اپنے گاؤں سے ایسا ڈر گئے تھے کہ ان کے قریب جانے کی دوبارہ ہمت انہیں نہیں پڑی اور اس کے بعد ان کا رشتہ اگر کسی سے تھا تو کشن سنگھ اور ان کے خاندان سے تھا۔ ان کی ماں بھی کہا کرتی تھیں، ''ارے کمو بھیا تو اپنے ہی ہیں۔ یہ میواتی بھی تو ایک زمانے میں ہماری ہی طرح ٹھاکر تھے۔ گاؤں کے کھاتے پیتے لوگوں میں تھے۔ وہ تو ان کے باپ نے مقدموں میں ساری جائداد لٹا دی۔ تمہارے بابو آپ ہی ان کو گاؤں سے بلا کر لائے تھے اور سارے باغ ان کے سپرد کر دیے تھے۔ وہی سب کچھ دیکھ بھال کرتے ہیں۔ ہمارے سوا ان کا ہے ہی کون۔''

''اماں، انھوں نے اپنی بیوی اور بچے کو کیوں چھوڑ دیا؟''

''پاگل ہیں اور کیا!'' پھر بات بدل دی۔ عرصے کے بعد انہیں معلوم ہوا کہ گھر جانے کے

سات مہینے بعد ان کی بیوی کے بیٹا ہوا—— بالکل کموخان کی شکل۔ لیکن انھوں نے نہ کبھی اپنے بیٹے کی شکل دیکھی نہ بیوی کی۔ حالانکہ وہ دونوں ان کے یہاں ہی رہتے رہے۔ نہ کموخاں نے بیوی کو طلاق دی نہ انھوں نے مانگی۔ وہ لوگ کہتے تھے، ''ہم ٹھاکروں کی اولاد ہیں، ہمارے یہاں طلاقیں نہیں ہوتیں۔'' ایک زمانے کے بعد کشن سنگھ کو احساس ہوا کموخاں کے متعلق ان کی والدین کی خاموشی میں کیسی وفاداری اور عزت چھپی ہوئی تھی۔ جو دکھ ان کو تھا اسے دونوں نے محسوس کیا تھا اور جو رشتہ ان کے ساتھ تھا اس کا یہی تقاضہ تھا کہ ان کے راز کو فاش نہ کیا جائے۔ کشن سنگھ بچپن کی حدوں کو پار کر کے جوانی کی منزل پر آگئے۔ ابھی کالج میں داخل ہوئے ہی تھے کہ سارے دیش میں ایک قیامت آگئی۔ آزادی کے ساتھ ساتھ ملک دو ٹکڑوں میں بٹ گیا اور اس طوفان میں کتنی جانوں کے ساتھ کتنے رشتے بھی ختم ہوگئے۔ کتنی قدریں بھی کھوگئیں۔ کسی طرح ان کا چھوٹا سا علاقہ پوری طرح اس تباہی کی زد میں نہ آیا۔ زیادہ تر آبادی ہندوؤں کی تھی۔ فسادات کی افواہیں دوسرے شہروں اور گاؤں سے آتی رہیں۔ دو ایک چھوٹے چھوٹے فسادات بھی ہوئے لیکن خون خرابہ زیادہ نہیں ہوا۔ کشن سنگھ والد خود کانگریس کے ممبر ہی نہیں قصبے کے لیڈر بھی تھے لیکن وہ ان کانگریسیوں میں تھے جنہوں نے اپنے آپ کو مذہبی تعصب سے بلند رکھا تھا اور یہ ان کا بھی اثر تھا کہ ان کا علاقہ تباہی سے بچ گیا۔

زمانہ گزر گیا۔ کشن سنگھ نے وکالت پاس کر کے باپ کی پریکٹس سنبھال لی۔ چالیس کا زمانہ بڑا طویل ہوتا ہے۔ ملک میں کتنی تبدیلیاں آئیں۔ کتنے گھر بگڑے، کتنے بنے۔ کتنی پرانی قدروں کی جگہ نئی قدروں نے لی۔ ان کا اثر کشن سنگھ اور ان کے خاندان پر بھی ہوا۔ ان کی لڑکیوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی، یونیورسٹی گئیں، نوکریاں کیں، شادی کے بعد اپنے اپنے گھروں کی ہوگئیں۔ ان کا بیٹا نہ صرف ولایت سے بیرسٹری پاس کر کے آیا، اپنے ساتھ انگریز بیوی بھی لایا۔ باغ میں بنی ہوئی کوٹھی میں وہ دونوں آباد ہوگئے۔ کشن سنگھ کو اپنے بیٹے کی پسند پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ انہیں مایوسی ضرور ہوئی کیونکہ اب ان کا گھر بالکل سونا ہوگیا۔ ان کے والدین بھی یکے بعد دیگرے انہیں چھوڑ کر سورگ باش ہوگئے۔ ماں باپ کسی کے ہمیشہ زندہ نہیں رہتے لیکن ان کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ ہم خود موت کے پاس آگئے ہیں۔ جیسے وہ دونوں ہمارے اور موت کے درمیان راستہ روکے ہوئے کھڑے تھے اور اب اس کا سامنا خود ہی کرنا پڑے گا۔ کشن سنگھ کو بھی یہی حساس ہوا۔ ابھی ان کے غم کا بوجھ ہلکا نہیں ہوا تھا کہ سارے ملک میں ایک بار پھر فسادات شروع ہوگئے۔ لیکن اس بار فضا دوسری ہی تھی۔ اس بار نعرہ

ہندوستان اور پاکستان کا نہیں تھا، بلکہ رام جنم بھومی کی حفاظت کا سوال تھا۔ وہ جنم بھومی جس کا نشان بھی کسی کو شاید ہی معلوم تھا لیکن ہر ایک کے ذہن میں بابری مسجد جو رام جنم بھومی کہی جا رہی تھی اس طرح ابھری تھی جیسے لکشمی سمندر سے ابھری ہوں۔ نعرے بلند ہو رہے تھے کہ ہر ہندو کا دھرم رام جنم بھومی کی حفاظت کرنا ہے۔ وہاں دوبارہ مندر بنانا ہے۔ اس کے بنانے میں چاہے کتنے ہی گھر بگڑ جائیں، کتنے ہی بے گناہ مارے جائیں، اس کی پروا رام جنم بھومی کی حفاظت کرنے والوں کو نہیں تھی۔ ہر طرف افواہیں پھیلی ہوئی تھیں۔ لوگ سہمے ہوئے تھے۔ کشن سنگھ بھی شہر کے لیڈروں میں شمار کیے جاتے تھے، لیکن وہ کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ ان کا وہ اثر نہیں تھا جو ان کے والد کا تھا۔ جو قدریں ان کو ورثے میں ملی تھیں وہ بڑی تیزی سے کھوتی جا رہی تھیں۔

ہندوؤں نے مسلمانوں کے محلوں میں اور مسلمانوں نے ہندوؤں کے محلوں میں جانا بند کر دیا تھا۔ جیسے چھوٹے چھوٹے ہندوستان اور پاکستان بن چکے تھے۔ کشن سنگھ کے مسلمان دوستوں نے مصلحتاً ان کے یہاں آنا بند کر دیا تھا۔ انھوں نے منہ سے کچھ نہیں کہا تھا لیکن کشن سنگھ سمجھ گئے تھے کہ وجہ کیا ہے۔ وہ خود ان کے یہاں جاتے رہے، اسی طرح ان کی خاطر مدارات ہوتی رہی، لیکن پرانا ماحول بدل گیا تھا۔ وہ زندگی نہیں رہی تھی۔ صرف سائے باقی رہ گئے تھے لیکن وہ بھی بڑھتے ہوئے اندھیروں میں کھوتے جا رہے تھے۔ مگر ساری تبدیلیوں کے باوجود کمو خاں اسی طرح اپنی پرانی وضع پر قائم رہے۔ جہاں سے وہ اپنا سودا سلف خریدا کرتے تھے، جس دکان سے وہ اپنے حقے کے لیے تمباکو لاتے تھے انہیں دکانوں پر وہ روزانہ جاتے تھے۔ انہیں لوگوں سے وہ برابر ملتے رہے جو ہمیشہ سے ان کے دوست تھے۔ کشن سنگھ کو خوف بھی ہوا کہ کہیں ان پر کوئی حملہ نہ کر دے۔ انھوں نے کمو خاں سے کہا بھی، ”کمو ممّا، تم آجکل باہر کم جایا کرو۔ کہیں کوئی غیر حملہ نہ کر دے۔ شہر کی آب و ہوا خراب ہے۔ تمہارا سودا کوئی نوکر لا دیا کرے گا۔“

”کیسی باتیں کرتے ہو بیٹا! میں مرد ذات ہوں، عورت نہیں کہ گھر میں بند ہو جاؤں۔ اور میں تو بوڑھا آدمی ہوں، نہ کسی کے لینے میں نہ دینے میں۔ سب مجھے جانتے ہیں۔ کس کی مجال ہے کہ مجھ پر ہاتھ اٹھائے۔ بیٹا ہم میواتی ٹھاکروں کی اولاد ہیں۔ کسی سے ڈرتے نہیں۔“ کشن سنگھ نے ان پر محبت آمیز نظر ڈالی۔ وہ بوڑھے ہو چکے تھے۔ لیکن محنت کی وجہ سے ان کا جسم اب بھی گٹھا ہوا تھا، اب بھی اسی طرح تن کر چلتے تھے۔ ان کی چوڑی ہڈی اور دراز قد دیکھ احساس ہوتا تھا کہ بڑھاپے نے ان کو اب تک مات نہیں دی تھی۔ گاؤں والوں کی طرح وہ بھی دھوتی کرتا ہی پہنتے تھے۔ ان کا لباس ان

کی بول چال وہی تھی جوان کے گاؤں والوں کی تھی۔ مگر ان کی سفید داڑھی دیکھ کر آسانی سے اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ وہ مسلمان ہیں۔ کشن سنگھ کو خیال ہوا سفید داڑھی جوان کے چہرے کو پر وقار بناتی ہے کسی کو ان پر حملہ کرنے کے لیے بھی اکسا سکتی ہے۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ ان سے کچھ کہنا بے کار ہے۔ وہ بے انتہا ضدی انسان ہیں۔ ایک دفعہ جو فیصلہ کرلیا ساری زندگی اس سے ہٹنا نہیں جانتے تھے۔ اپنی اسی ضد کی وجہ سے ساری زندگی اکیلے ہی گزار دی۔

اس دن وہ ابھی پلنگ سے اٹھے بھی نہیں تھے کہ باغ سے ایک مالی گھبرایا ہوا آیا۔ اس نے آ کر بتایا کہ کمو خاں شام کو سودا سلف لینے بازار گئے تھے، اب تک واپس نہیں آئے۔ نہ معلوم کہاں غائب ہوگئے ہیں۔ کشن سنگھ گھبرا اٹھے۔ اور مالی کو بلا کر ڈانٹنے لگے۔ ''ساری رات انتظار کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس سے پہلے کیوں نہیں آئے؟ بیوقوف کہیں کے۔'' وغیرہ وغیرہ۔

مالی بیچارہ کم عمر لڑکا تھا۔ نیا نیا گھر سے آیا تھا۔ صبح صبح اٹھ کر کمو خاں کے کمرے میں تالا لگا دیکھ کر ان کے پاس آیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کا کیا قصور ہے۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ صاحب کا غصہ اس پر نہیں ان سارے لیڈروں پر تھا جو خاموشی سے سب دیکھ رہے تھے اور مخالفت اس لیے نہیں کرتے تھے کہ اگلے الیکشن میں ووٹ کم ہوجائیں گے۔ دھرم کے ان رکھشکوں پر تھا جو رام جنم بھومی میں مندر بناتے بناتے اس نیو کو کھود رہے تھے جو گاندھی جی نے ڈالی تھی اور جس کی حفاظت کے لیے اپنی جان کی قربانی دے گئے تھ۔ لیکن سب سے زیادہ غصہ انہیں اپنے اوپر تھا کہ وہ اس شخص کی حفاظت نہ کرسکے جنھیں ان کی ماں نے اپنے مائکے کے رشتے سے ہمیشہ بھیا کہہ کر پکارا تھا اور جنھوں نے اپنا خاندان چھوڑ کر ان سب کو ہی اپنا لیا تھا۔

دن کے بارہ بج رہے تھے۔ کشن سنگھ کچھ کھائے پیے بغیر آفس میں ٹہل ٹہل کر پولیس اور ضلع کے حاکموں کو فون کرکے ان کے جواب کا انتظار کررہے تھے۔ ان کی بیوی انہیں سمجھا رہی تھیں، ''گھبراتے کیوں ہو۔ بوڑھے آدمی ہیں، ہوسکتا ہے راستے میں کہیں طبیعت خراب ہوگئی ہو۔ کسی دوست یا جان پہچان والے کے پاس رک گئے ہوں گے۔''

''مجھے بچوں کی طرح کیوں بہلا رہی ہو؟ تم تو جانتی ہمارے سوا اس شہر میں ان کا کوئی نہیں ہے،'' انھوں نے چڑ کر جواب دیا اور اسی طرح بے چینی سے ٹہلتے رہے۔ فون کی گھنٹی بجی اور اس سے پہلے کہ ان کا کلرک فون اٹھائے، انھوں نے خود ہی فون لے کر جواب دیا،''ہلو میں کشن سنگھ بول رہا ہوں۔'' فون پر بات

ختم کر کے انھوں نے اپنے کلرک سے کہا، ''تھانیدار کا فون ہے۔ ایک لاش شہر کے باہر پڑی ہوئی ملی ہے۔ اس کی شناخت کے لیے مجھے بلایا ہے۔ گھر میں جا کر بتا دو،'' اور پھر جلدی سے تھانے چلے گئے۔

جب سے معلوم ہوا تھا کہ مو خاں رات بھر غائب تھے انہیں یقین سا تھا کہ وہ اب زندہ نہیں ہیں، لیکن جب لاش کے چہرے سے چادر ہٹائی گئی تو ان کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا، ''ہائے رام!'' انہیں یہ توقع نہیں تھی کمو خان کی لاش کی اس طرح بے حرمتی کی جائے گی۔ ان کی سفید نورانی داڑھی کو جلایا گیا تھا جس کی وجہ سے پلکیں بھنویں سب جل گئی تھیں، چہرہ مسخ اور سیاہ ہو گیا تھا۔ پھر کشن سنگھ کا گلا رندھ گیا۔ ان کی آواز کہیں کھو گئی۔ لیکن ان کے آنسوؤں کا باندھ ٹوٹ گیا۔ کشن سنگھ جنھوں نے اپنے باپ اور ماں کے غم کو بڑے وقار سے سہا تھا، ان کی یاد میں صرف اپنے کمرے میں آنسو بہائے تھے، اب کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے اور آنسوؤں کی قطار ان کی آنکھوں سے اس طرح بہہ رہی تھیں جیسے ان کے والدین اور کمو خاں کی موت اسی دن ہوئی ہو۔ ان کی بھیگی آنکھوں کے سامنے وہ ساری تصویریں گزر رہی تھیں جنہیں بڑے قیمتی سرمائے کی طرح انھوں نے اپنے دل اور ذہن کے گوشوں میں محفوظ کر لیا تھا۔ کلرک اور ڈرائیور دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایک نوکر نے مرنے پر اتنا غم کیوں ہے اور کیا کہہ کر ان کو دلاسہ دیا جائے۔ جب تک کار گھر آ کر رکی کشن سنگھ نے اپنے جذبات پر قابو پا لیا تھا۔ کلرک نے پوچھا، ''صاحب کمو خاں کے گاؤں خبر بھجوا دوں؟''

''ہاں،'' انھوں نے مختصر سا جواب دیا۔ پھر کچھ سوچ کر بولے، ''کورٹ میں خبر دے دو کہ آج میرے مقدموں کی تاریخ بڑھا دی جائے۔''

کلرک ہکا بکا ہو کر ان کا چہرہ دیکھتا رہا۔ سوائے اپنے والدین کی موت کے وہ آج تک غیر حاضر نہیں ہوئے تھے۔ شام ہونے سے پہلے ہی گاؤں سے آنے والے رشتہ داروں کو لاش مل گئی۔ پولیس والے چاہتے تھے کہ جلدی ہی دفنا دیا جائے۔ رشتہ داروں میں کمو خاں کا بیٹا بھی شامل تھا۔ اسے دیکھ کر کشن سنگھ کو محسوس ہوا جیسے وہ کمو خاں کو دیکھ رہے ہوں۔ اس کی شکل، اس کے جسم کی ساخت، اس کا باتیں کرنے کا انداز ہو بہو اپنے باپ کا چربہ تھا، مگر شاید اس باپ کو اس نے کبھی دیکھا بھی نہیں تھا۔ وہ کشن سنگھ کی طرح کبھی ان کی گود میں نہیں بیٹھا تھا نہ ان کے کندھوں پر بیٹھ کر چاند کے ساتھ ساتھ چلا تھا، نہ وہ اس کے لیے میٹھے میٹھے پھلوں کے تحفے لائے تھے، بلکہ اس باپ کے غصے کی بنا پر اپنی ماں کی بدنامی کا داغ اپنی پیشانی پر لے کر اب تک زندگی گزاری تھی۔ آج وہ اس باپ کی لاش

لینے آیا تھا جس نے اپنے خاندان اور اپنی اولاد کو رد کر کے کشن سنگھ اور ان کے والدین کو اپنایا تھا۔ اس رشتے کو وہ کس نام سے یاد کریں یہ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

جب انھوں نے کفن دفن اور دوسرے اخراجات دینے کے لیے کہا تو کمو خان کے رشتے داروں نے اسے رد کر دیا۔ لاش کو تھانے سے مسجد لے جایا گیا تھا اور غسل کے بعد کفن پہنا کر چہرے کو ڈھک دیا گیا تھا۔ وہ اتنا بگڑ گیا تھا کہ پہچاننا بھی مشکل تھا۔ نماز جنازہ میں کشن سنگھ شریک نہیں ہو سکتے تھے اور یہ خطرناک بھی تھا کیونکہ کمو خاں کی موت نے اس شہر اور آس پاس کے گاؤں میں غصے اور انتقام کی لہر دوڑا دی تھی۔ صرف اس لیے ہی نہیں کہ ایک بے گناہ اور معصوم شخص کا قتل کیا گیا تھا بلکہ جس طرح ان کی بے حرمتی کی گئی تھی اس سے ان کے ہم مذہبوں کو محسوس ہو رہا تھا کہ ان کی بھی بے حرمتی کی گئی ہے۔ یہی جذبہ کشن سنگھ کے دل میں بھرے شعلوں کی طرح بھڑک رہا تھا۔ کمو خاں صرف ان کے جگہ باغ کے مالی ہی نہیں تھے وہ ان کی ہی طرح ٹھاکروں کی اولاد تھے۔ ان کی ماں کی یادیں ان سے وابستہ تھیں۔ ٹھاکروں کا خون ان کی رگوں میں بدلہ لینے کے لیے پکار رہا تھا۔ لیکن وہ کس سے بدلہ لیتے؟ اس گمنام قاتل سے جس نے کمو خاں کی بے حرمتی کی تھی، ان دھرم کے رکھشکوں سے جنھوں نے یہ آگ بار بار بھڑکائی تھی یا ان لیڈروں سے جو خاموشی سے سب دیکھ رہے تھے؟ نہ جانے کتنے جذبات ان کے دل میں طوفان کی طرح اٹھ رہے تھے اور وہ خاموشی سے کمو خاں کے جنازے کے ساتھ قبرستان کی طرف جا رہے تھے۔

جنازہ بغیر کسی فساد کے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ حفاظت کے لیے پولیس بھی ساتھ تھی۔ مگر ہر ایک دل پر غصہ اور خوف تھا۔ جو جنازے کے ساتھ تھے ان میں سے کتنوں نے اس سے پہلے کمو خاں کا نام بھی نہیں سنا تھا لیکن سب کے دل میں خوف تھا کہ نہ جانے کون ایک نئی تباہی کی زد میں آ جائے گا۔

کشن سنگھ جنازے ساتھ آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ انھیں محسوس ہو رہا تھا کہ اتنے بڑے ہجوم میں وہ بالکل اکیلے ہیں لیکن خیالات کا یلغار ان کے ساتھ تھا۔ ان کے ذہن میں ایک سوال ابھرا:

”کیا وہ صرف کمو خاں کو ہی دفن کرنے جا رہے ہیں یا ان کے ساتھ ان قدروں ان پیار کے رشتوں کو بھی دفن کرنے جا رہے ہیں جو ایک انمول سرمائے کی طرح سینہ بسینہ انہیں ورثے میں ملا تھا؟“

لیکن دل کی عمیق گہرائیوں سے کسی امید نے آہستہ سے جواب دیا، ”نہیں۔“

ایک چھوٹی سی کہانی

(اس مختصر افسانے کا انحصار ایک سچے واقعے پر ہے)

مسٹر شری واستو نے آہستہ سے بچی کو میز پر لٹا دیا۔ چھ مہینے کی جان بالکل نڈھال ہوگئی تھی۔ کئی ہفتوں سے دوائیں برابر چل رہی تھیں۔ تین چار دن ایسا لگتا تھا کہ اب ٹھیک ہوگئی ہے لیکن پھر بخار آنے لگتا اور جہاں وہ پہلے تھی وہیں کے وہیں پہنچ جاتی۔

گھر کے پاس ہی ایک ہسپتال تھا۔ ڈاکٹروں سے صاحب سلامت تھی اس لیے جلدی ہی ہسپتال لے گئے تھے اور علاج شروع ہوگیا تھا۔ لیکن باوجود کوششوں کے بچی صحت یاب نہیں ہو پائی تھی اور اب تو ایسی کمزور ہوگئی تھی کہ گود میں اٹھانے پر محسوس ہوتا تھا جیسے پھول ہے۔

مسٹر شری واستو کو بچی سے بڑی محبت تھی۔ لوگ کہتے ہیں لڑکی پرائے گھر کا دھن ہوتی ہے اور سچ بھی ہے۔ پیدا ہوتی ہیں ننھی کلی کی طرح اور چند سال گھر کے آنگن میں کھیل کر کیسی جلدی بڑھ جاتی ہیں اور ایک دن نظر بھر کر دیکھو تو تعجب ہوتا ہے کہ ابھی دو دن ہوئے اس کا جنم ہوا تھا، اب دیکھو تو ترئی کی بیل کی طرح بڑھ کر کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ اور پھر فکر ہوتی ہے بَر کی۔ لیکن مسٹر شری واستو کو ان باتوں کی فکر نہیں تھی۔ انہیں بیوی سے زیادہ بچی کی خواہش تھی۔ شادی ذرا دیر میں کی تھی۔ اب عمر تقریباً چالیس سال کی تھی اور جب انہیں معلوم ہوا کہ بچی ہوئی ہے تو ان کا دل باغ باغ ہوگیا تھا جیسے گھر میں بڑے ارمانوں کے بعد بیٹا ہوا ہو۔ اور بڑے پیار سے انھوں نے اس کا نام رکھا تھا سیما — جیسے وہ ان کی خوشیوں کی سیما (حد) ہو۔

اور اب وہ میز پر نڈھال پڑی ہوئی تھی۔ بیوی کی آنکھوں میں آنسو تھے لیکن شری واستو بہت تن کر کھڑے ہوئے تھے، جیسے فوج میں معائنہ کے لیے سپاہی کھڑا ہوتا ہے۔ ان کے چہرے پر سختی اور عزم کے نشان تھے۔ وہ دراصل اپنے اندر کے طوفان سے لڑ رہے تھے۔ بچی کی حالت دیکھ کر انہیں خیال ہو رہا تھا کہ وہ چند دن کی مہمان ہے، لیکن اپنا خوف وغم وہ بیوی پر ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے۔

ڈاکٹر نے دونوں کی طرف بڑی تشویش سے دیکھا۔ پھر کہا، ''مسٹر شری واستو، سمجھ میں نہیں آتا

کہ کیا کریں جو بیماری قابو میں آئے۔ دیکھیے دوا بدلتے ہیں۔" پھر مسٹر شری واستو کی طرف دیکھ کر بولے،" آپ بھگوان سے پرارتھنا کیجیے۔ وہی کچھ راستہ بتائیں گے۔ مسٹر شری واستو، آپ میرے ساتھ چلیے، میں آپ کو جلدی سے دوا دلوادوں ورنہ دیر تک لائن میں کھڑا ہونا پڑے گا۔ مسز شری واستو، آپ بچی کو گود میں لے کر بیٹھیے، میں ابھی ان کو بھیجتا ہوں۔"

باہر آکر ڈاکٹر نے کہا،" مسٹر شری واستو، میں آپ سے صاف صاف بات کرنے آپ کو اپنے ساتھ لایا ہوں۔ ہم نے بار بار دوائیں بدلی ہیں پھر بھی بیماری قابو میں نہیں آئی۔ اب بچی بڑی کمزور ہوگئی ہے۔ اس وقت معائنہ کے بعد میرا خیال ہے اس کے دماغ کے ایک حصے پر سوجن آگئی ہے جو بہت خطرناک ہے۔ میں نے دوا بدلی ہے۔ آپ بچی کو گھر لے جائیے۔ اگر حالت ٹھیک نہ ہوئی تو ہم چند اور ڈاکٹروں کی رائے لیں گے۔ اگر انھوں نے ہم سے اتفاق کیا تو آپریشن کرنا پڑے گا۔ آپ بس یہ بھروسا رکھیے کہ ہم اپنی سی کوشش نہیں چھوڑیں گے، لیکن زندگی موت تو بھگوان کے ہاتھ میں ہے۔"

ڈاکٹر کی بات سن کر مسٹر شری واستو کا گلا بھر آیا۔ انھوں نے کچھ کہے بغیر ڈاکٹر کو التجا آمیز نظر سے دیکھا اور صرف ہاتھ جوڑ کا ان کا شکریہ ادا کیا اور جلدی ہی دوا لے کر وہ گھر چلے گئے۔ ہدایت کے مطابق کئی خوراکیں دیں، لیکن حالت سنبھلنے میں نہیں آرہی تھی۔

دوسرے دن شام کو ڈاکٹر کو دکھانا تھا۔ اب بچی بالکل نڈھال ہوگئی تھی۔ جانے کیسے انھوں نے دفتر میں وقت کاٹا۔ کسی نہ کسی طرح عادتاً وہ کام کررہے تھے، لیکن دل ان کا گھر میں تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ساری فائلوں میں بیوی کا اداس اور تھکا ہوا چہرہ ہی نقش تھا۔ یا پھر سیما کی تصویر ان کی آنکھوں میں پھر جاتی۔

گھر سے آفس دور نہیں تھا اور وہ زیادہ تر گھر جا کر ایک پیالی چائے اور کچھ ہلکا سا ناشتہ کر کے ذرا آرام کرنے کے بعد آفس واپس آجاتے۔ لیکن آج لگتا تھا کہ دو پہر شاعر کے معشوق کی طرح ہوگئی ہے۔ ایک ایک پل انہیں ایک ایک گھنٹے کی طرح لگ رہا تھا۔ خدا خدا کر کے اٹھے اور مسٹر دوبے کے پاس جا کر بولے،" میں آج ذرا جلدی جارہا ہوں۔ ایک گھنٹے میں واپس آجاؤں گا۔ بچی کی طبیعت سنبھلنے میں نہیں آتی۔ بھگوان جانے کیا ہوگا۔" پھر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر چلنے کو تھے کہ مسٹر دوبے بڑی ہمدردی سے بولے،" ارے صاحب آپ فکر نہ کیجیے۔ جائیے اپنی مسز کی ذرا ہمت بندھائیے۔" مسٹر شری واستو سر جھکا کر دروازے کی طرف چل دیے۔ گھر پہنچے تو دیکھا سناٹا چھایا ہوا

ہے۔ کمرے میں جا کر دیکھا تو بیوی دیوار سے لگ کر آنکھیں بند کیے بیٹھی ہیں۔ شری واستو کے آنے پر آنکھیں کھول کر ان کی طرف دیکھا۔ پھر اٹھ کھڑی ہوئیں اور بولیں، ''تم منہ ہاتھ دھولو۔ میں جل پان کے لیے کچھ لے آؤں۔'' شری واستو سر ہلا کر بولے، ''نہیں کچھ جلدی نہیں ہے۔ میں مسٹر دوبے سے کہہ آیا ہوں۔ سیما کیسی ہے؟'' بیوی بولیں، ''ویسی ہی ہے۔ اب تو کمزوری کی وجہ سے روتی بھی نہیں ہے۔ میں نے آج کچھ پکایا نہیں۔ تمہارے لیے کل کے پراٹھے رکھے ہیں وہی گرم کروں گی۔'' شری واستو بولے، ''کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے بھوک بھی نہیں ہے۔ تم بیٹھو۔ دیکھو تو تمہارا منہ کیسا سوکھ گیا ہے۔'' پھر بولے، ''سیما ذرا اچھی ہو جائے تو چھٹی لے کر تمہارے گھر رائے بریلی جائیں گے۔ کتنے دن سے ہمارے سالے ہمیں بلا رہے ہیں۔'' بیوی نے ان کی طرف دیکھا۔ بغیر کچھ کہے ہوئے دونوں ایک دوسرے کے دل کا حال جانتے تھے۔ مسز شری واستو خوب جانتی تھیں کہ یہ باتیں دل بہلانے کی ہیں۔ مسٹر شری واستو ناشتہ ختم کر کے بولے، ''آج شام کو فیصلہ کریں گے کہ ہسپتال میں داخل کروائیں گے کہ نہیں۔ میں موجود ہوں، تم اب ذرا آرام کرلو۔ فکر کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ بھگوان جو کریں گے وہ ٹھیک کریں گے۔ ہم ان کے بھید کیا جانیں۔ بس تم پرارتھنا کرو۔ ڈاکٹر بھی یہی کہتا تھا۔'' پھر وہ خاموش ہو کر لیٹ گئے۔ بیوی ان کے پاس آ کر ان کے کندھے پر سر رکھ کر لیٹ گئیں۔ دونوں کو نیند کیا آتی، صرف ایک دوسرے کی قربت سے ذرا سکون آ گیا۔ وقت ہو گیا تو مسٹر شری واستو نے اٹھ کر بچی کو ذرا سا گلوکوز دیا اور اس کا گدا بدلا۔

آفس کا وقت ہو گیا تھا۔ مسٹر شری واستو اٹھ کھڑے ہوئے۔ بیوی سے بولے، ''حالت ایک سی ہی ہے۔ تم تیار رہنا۔ آج شام کو ہسپتال لے جائیں گے۔''

شام ہوئی تو مسٹر شری واستو گھر آئے۔ تھوڑی دیر آرام کر کے بولے، ''چلو ہسپتال چلیں۔ میں رکشا لے آتا ہوں۔ تم اس کو نئی فراک پہنا دو جو میں اس کی طبیعت خراب ہونے سے پہلے لایا تھا۔'' بیوی نے ان کی طرف تعجب سے دیکھا اور بولیں، ''کیوں؟ ہسپتال ہی تو جا رہے ہیں۔''

مسٹر شری واستو بولے، ''ہاں۔ لیکن پہلے اس کی تصویر کھنچوائیں گے۔ تم بھی ساڑی بدل لو۔ اس کو گود میں لے کر تصویر کھنچوانا۔''

بیوی ان کا مطلب سمجھ گئیں۔ دل پر ایک تیر سا لگا لیکن کچھ بولیں نہیں۔ تھوڑی دیر میں ماں اور بیٹی تیار ہو گئیں۔ مسٹر شری واستو نے بچی کی طرف دیکھا۔ بالکل گڑیا معلوم ہو رہی تھی۔ گندمی رنگ

بیماری کی وجہ سے دھلے کپڑے کی طرح سفید ہوگیا تھا، لیکن گلابی فراک کا عکس اس کے چہرے پر پڑ رہا تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں کھولے ٹکٹکی باندھے باپ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ رکشا آ گیا۔ مسز شری واستو اسے شال میں لپیٹ کر رکشے میں بیٹھ گئیں اور تینوں فوٹو گرافر کی دکان پر پہنچے۔ مسٹر شری واستو پہلے ہی وقت ٹھیک کر کے آئے تھے اس لیے جلدی ہی فوٹو گرافر نے کئی تصویریں لے لیں۔ وہ مسٹر شری واستو کو اچھی طرح جانتا تھا اور اسے موقع کی نزاکت کا بھی احساس تھا۔ اس نے خاموشی سے بچی کی اکیلی تصویر اور پھر ماں باپ کے ساتھ بھی لی۔ پھر بولا، ''اگلے ہفتے تصویریں تیار ہو جائیں گی۔ آپ آ کر لے جائیں، یا میں ہی آفس میں دے آؤں گا۔'' اسے بچی کی بیماری کا حال معلوم تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ یہ تصویریں شری واستو نے کیوں کھنچوائی تھیں۔ بچی آہستہ آہستہ رو رہی تھی اور مسز شری واستو اسے گود میں ہلا ہلا کر آرام دینے کی کوشش کر رہی تھیں۔

فوٹو گرافر مسٹر شری واستو سے آہستہ سے بولا، ''آپ بٹیا کو ایک بار ڈاکٹر اگروال کو بھی دکھالیں میرے کہنے سے۔ وہ ابھی دواخانے میں بیٹھیں گے، جلدی سے چلے جایئے۔''

شری واستو بولے، ''ہاں ان کا نام ہے اور بڑے بھلے آدمی ہیں۔ آپ کہتے ہیں تو ان کے پاس بھی چلے جائیں گے۔''

ڈاکٹر اگروال کا مطب ابھی اچھی طرح کھلا بھی نہیں تھا کہ شری واستو بیوی اور بچی کو لے کر پہنچ گئے۔ اس میں شبہ نہیں ڈاکٹر اگروال بڑے بھلے آدمی تھے۔ وہ ان لوگوں میں تھے جو ڈاکٹری کے پیشے میں اس لیے آتے ہیں کہ خلق خدا کی خدمت کر سکیں۔ خدا نے ان کے ہاتھ میں شفا دی تھی۔ اگر چاہتے تو لاکھوں کماتے۔ وہ کہا کرتے تھے، ''میں ڈاکٹر ہوں روزگار نہیں کرتا۔'' خاص کر بچوں کے امراض کے ماہر تھے۔

شری واستو کی بچی کا بڑی دیر تک معائنہ کیا، پھر بولے، ''بڑی کمزور ہوگئی ہے لیکن دماغ پر سوجن تو نہیں معلوم ہوتی۔ ویسے بھی یہ آپریشن برداشت نہیں کر سکے گی۔ اگر آپ ہسپتال نہ جانا چاہیں تو میں علاج شروع کروں۔'' مسز شری واستو جلدی سے بولیں، ''ڈاکٹر صاحب آپ علاج شروع کر دیجیے۔ بھگوان نے دَیا کی تو آپ کے ہی ہاتھ سے ٹھیک ہوگی۔''

ڈاکٹر صاحب نے نسخہ لکھا اور علاج شروع کیا۔ ایک ہفتے میں ہی بچی کی حالت بدل گئی۔ بخار اتر گیا۔ دودھ ہضم ہونے لگا۔ آہستہ آہستہ چہرے پر رونق آنا شروع ہوگئی۔ جب فوٹو گرافر

تصویریں لے کر آیا تو شری واستو نے بڑی خوشی سے بتایا، ''بھیا، بٹیا تو اب ٹھیک ہوگئی۔'' پھر ذرا جھجھک کر بولے، ''ہم نے تو اس لیے تصویریں کھنچوائیں تھیں کہ نہ جانے کیا ہو۔ اس کی تصویر تو رہ جائے گی۔'' فوٹوگرافر نے مسکرا کر بدھائی دی۔

کچھ عرصہ گزر گیا۔ شری واستو ڈاکٹر اگروال کے پاس گئے تھے۔ ان کی بٹیا سیما اب گھٹنے گھٹنے چلنے لگی۔ باپ کو دیکھتے ہی ہاتھ اٹھا کر ان کی گود میں آجاتی۔ جسم بھی بھر آیا تھا۔ شری واستو حالانکہ بیوی کی کھانسی اور زکام کی دوا لینے آئے تھے لیکن باتیں بٹیا کی ہی کر رہے تھے۔ ڈاکٹر اگروال کو بھی سن کر خوشی ہو رہی تھی۔ آخر کار بچی کو ان کی ہی دوا سے شفا ہوئی تھی۔ دواخانے میں اس وقت بہت کم لوگ رہ گئے تھے۔ اور ان میں اسی محلے کے رہنے والے ایک میر صاحب بھی تھے۔ غریب لیکن شریف گھرانے کے انسان تھے۔ بالکل خاموش بیٹھے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھی چلے گئے۔ شری واستو نے ڈاکٹر اگروال سے کہا، ''ڈاکٹر صاحب یہ میر صاحب بڑے رنجیدہ معلوم ہو رہے تھے۔'' ڈاکٹر اگروال بولے، ''ہاں کل ان کی بچی کی موت ہوگئی۔ بالکل آپ کی بچی کے برابر تھی۔ مرض بھی وہی تھا جو آپ کی بچی کو تھا۔ میں ان کے حالات جانتا ہوں۔ دواؤں کے پیسے ان کے پاس نہیں ہیں۔ پھر بھی دوائیں ان کو دلوا دی گئیں۔ فائدہ نہیں ہوا۔ میں نے کہا آپ بچی کو دودھ پھاڑ کر اس کا پانی دیجیے۔ اب اتنی کمزور ہوگئی ہے کہ خالص دودھ اس کو ہضم نہیں ہوگا، تو بیچارے بڑے شرمندہ ہو کر بولے، ڈاکٹر صاحب آپ دودھ کی باتیں کرتے ہیں۔ اس کے پیسے کہاں ہیں۔ ماں کا دودھ مل جائے وہی بہت ہے، ورنہ پانی میں ذرا سا میدہ اور شکر پکا کر بچوں کو دیتے ہیں۔ غریبوں کے بچے بچپن سے ہی فاقہ کرنا سیکھتے ہیں۔ میں سن کر خاموش ہوگیا۔ کہہ بھی کیا سکتا تھا۔ دوا دے دی لیکن بچی ختم ہوگئی۔ بچتی بھی کیسے! جسم میں کچھ جان ہو تو دوا کام کرے۔''

ڈاکٹر اگروال کی بات سن کر شری واستو کا سر جھک گیا۔ ان کے پاس بھی مجبوری کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔

بیٹیاں

اسے دو دن کے لیے گاؤں سے باہر جانا تھا۔ گھر آ کر وہ جلدی جلدی کھانا کھا رہا تھا۔ پاس ہی اس کی بیوی للیتا خاموش بیٹھی ہوئی اسے پنکھا جھل رہی تھی۔ اس کا مرجھایا ہوا چہرہ دیکھ کر رامو کا دل دکھ گیا۔ اس نے سوچا، کتنا کٹھن کام کرنے کو اسے دیا ہے میں نے۔

''تجھ سے وہ کام ہوگا نہیں،'' اس نے للیتا کی طرف دیکھے بغیر نرمی سے کہا۔

''تو کیا کروں؟ دہیج دینے کو پیسہ کہاں سے آئے گا؟'' للیتا نے کہا۔

''اماں کیا کہتی ہے؟'' رامو نے پوچھا۔

''اماں سے کہنے کی میری ہمت نہیں پڑی۔ تم ہی پوچھو کہ ایسا کام کرے گی کہ نہیں۔ جب پیدا ہوئی تھی تو مجھے بتائے بغیر اس کا گلا کیوں نہیں گھونٹ دیا۔ ایک منٹ بھی تو نہ لگتا۔'' اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

رامو کے منہ میں چاول کے دانے کڑوے ہو گئے۔ کسی طرح انہیں نگل کر اس نے تھالی ایک طرف ہٹا دی اور لوٹا لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ نالی کے پاس بیٹھ کر اس نے ہاتھ دھوئے اور پھر منہ پر پانی ڈال کر اپنے آنسو للیتا سے چھپا کر دھو ڈالے۔ دری میں لپٹا ہوا اپنا سامان اٹھا کر للیتا سے بولا، ''اب چل دیا میں، نہیں تو دیر ہو جائے گی۔ تو تو جانتی ہے ہم مجبور ہیں۔'' اور جملہ ختم کیے بغیر وہ چلا گیا۔

اب وہ دو دن بعد اپنے گھر کے سامنے کھڑا ہوا تھا، وہ گھر جس کے اب نشان ہی باقی رہ گئے تھے۔ سارا گاؤں ایسے تباہ ہو گیا تھا جیسے بچوں کا گھروندا ہو اور کسی نے ناراض ہو کر اسے ٹھوکر مار کر تہہ و بالا کر ڈالا ہو۔ منہ پھاڑے وہ اس جگہ کو دیکھ رہا تھا جہاں اس کا گھر تھا لیکن اب وہاں صرف اینٹوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ اس کے سینے میں ایک ہوک سی اٹھی اور وہ وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ لیکن اس کی وحشی آنکھیں خشک تھیں۔ آنسو اس کا گلا گھونٹ رہے تھے جیسے پھانسی کا پھندا ہوں۔

اٹھ کر اس نے پاگلوں کی طرح اینٹیں اٹھا اٹھا کر پھینکنا شروع کیں۔ مٹی ہٹا کر اس کے نیچے

دبی ہوئی چیزوں کو نکال نکال کر دیکھ رہا تھا۔ ٹوٹے ہوے مٹی کے برتن۔ پیتل کا لوٹا جواب بھی چمک رہا تھا۔ للیتا کی رنگین ساڑی۔ بھگوان کی مورتی جس کی پوجا اس کی ماں روز کرتی تھی۔ ''برسوں کی پوجا کے بعد بھی تم مٹی کا پتلا ہی رہے۔ اپنے پجاریوں کو بچانے کے لیے کچھ بھی تو نہیں کیا،'' اس نے سوچا اور مورتی کو زور سے پٹخ دیا۔ وہ ٹکڑے ہوکر بکھر گئی۔

اور اس کی ماں کا ٹین کا صندوق جس میں ہمیشہ تالا پڑا رہتا تھا۔ وہ جانتا تھا اس کی چابی ماں کے پلو میں بندھی رہتی ہے۔ اس نے کبھی نہیں پوچھا تھا، ''ماں اس میں کیا ہے؟'' آج وہ کھلا ہوا خالی پڑا تھا۔ سارے گاؤں کو زلزلے نے ہی تباہ نہیں کیا تھا، لٹیرے بھی آکر جو ہاتھ آیا لے کر نہ جانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔ اب سوائے گاؤں کے کتوں کے وہاں کوئی بھی نہیں تھا اور وہ ایسے بھونک رہے تھے جیسے ان کا گلا پڑ گیا ہو۔ ایک عجیب سی ڈراؤنی آواز ان کے منہ سے نکل رہی تھی۔

اس کے ہاتھ لہولہان ہو چکے تھے۔ بہتا ہوا خون اپنے کرتے سے پونچھ کر وہ شل ہوکر اپنے گھر کی ٹوٹی دیوار سے سر ٹکا کر بیٹھ گیا۔ اس منظر کو اپنی آنکھوں سے دور کرنے کے لیے اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

''یہ ہم سب کے پاپوں کا پھل ہے،'' اس نے سوچا۔ معصوم کی ہتیا کا پاپ کرکے ہم نے کیوں یہ نہیں سوچا کہ بھگوان ہمیں اس کی سزا دیں گے۔ ان سارے گھروں میں رات کے اندھیرے میں چپکے چپکے کتنی ننھی ننھی جانیں لی گئی ہیں۔ ان پاپیوں میں میں بھی تو تھا۔ میں نے بھی تو للیتا سے کہا تھا کہ ہمارے پاس دہیج میں دینے کو پیسے کہاں ہیں۔ اسے ہمیشہ کے لیے سلانا ہی پڑے گا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔

''ارے تو کب واپس آیا؟''

اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا، اس کا پڑوسی کھڑا ہوا تھا۔

''ابھی آیا ہوں،'' اس نے اپنے گرد آلود ہاتھوں سے آنسو پونچھ کر کہا۔

''تجھے معلوم تھا کیا ہوا؟''

''ہاں پر آتے آتے دیر ہوگئی۔ جلدی آتا بھی تو کیا کر لیتا۔''

''کچھ بھی نہیں۔''

''لاشیں کہاں گئیں؟'' رامو نے پوچھا۔

''سب جلادی گئیں۔ شہر سے بہت لوگ آئے تھے۔ زخمیوں کو ہسپتال لے گئے۔ میں بھی باہر گیا تھا اس لیے بچ گیا۔''

''میرے یہاں کوئی نہیں بچا؟''

''کوئی نہیں۔ بس تیری بیٹی میں جان تھی۔ للیتا اسے اپنے بدن سے ڈھانکے ہوئے چارپائی کے نیچے مری ملی۔''

''کہاں ہے میری بیٹی؟'' اس نے چیخ کر پوچھا۔

''سنا ہے ہسپتال میں ہے۔ سب کو اس کے بچنے کا بڑا اچنبھا ہوا...''

رامو پوری بات سے بغیر ہسپتال کی طرف دوڑ رہا تھا۔

''یہ ہے تمہاری بٹیا،'' نرس نے ملائم کپڑے میں لپٹی ایک چھوٹی سی گڑیا جیسی بچی اس کے پھیلے ہوئے ہاتھوں میں دے دی۔

وہ اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا اور آنسوؤں کی لڑیاں اس کے چہرے پر سے گر رہی تھیں۔ اسے لگا وہ اپنی بیٹی کو ہی نہیں للیتا کو دیکھ رہا تھا، اپنی ماں کو دیکھ رہا تھا اور قطار در قطار ان عورتوں کو دیکھ رہا تھا جو اپنی ننھی ننھی بیٹیوں کو بانہوں میں سنبھالے کھڑی تھیں۔

دور کی آواز

دن ڈھل چکا تھا۔ سورج کی تمازت کم ہوگئی تھی۔ برآمدے کے پاس لگی ہوئی لیٹر کی بیل پر ایک چڑیا اپنے گھونسلے کے پاس بیٹھی گردن گھما گھما کر ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ شاید وہ اپنے ساتھی کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کے پاس ہی فاختاؤں کا جوڑا غٹرغوں غٹرغوں کرتے ہوئے فرش سے کچھ چن چن کر کھا رہا تھا۔ چاروں طرف سکون تھا۔ اس نے بھی آنکھیں بند کر کے کرسی کی پشت پر اپنا سر لگا دیا۔

''دیدی کیا سوگئیں؟'' اجے اس سے پوچھ رہا تھا۔

''نہیں،'' اس نے سیدھے بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ ''بس ذرا آرام کر رہی تھی۔''

اسے یہ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی کہ رتن جوشی نے کیوں فون کیا تھا۔ لیکن اجے نے خود ہی کہا، ''رتن جوشی کا فون آیا تھا آج۔ برسوں بعد۔ مجھے تعجب بھی ہوا۔ کہہ رہے تھے بابا کو دیکھنے آیا چاہتے ہیں۔ کسی سے سنا ہے کہ ان کی طبیعت خراب ہے۔ میں نے کہا ضرور آیئے۔ وہ اب پہلے سے بہت بہتر ہیں۔ آپ سے مل کر بڑے خوش ہوں گے۔'' اجے نے اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں تمہاری شادی پر اپنی بیوی اور بچی کے ساتھ آئے تھے۔ اس کے بعد تو مجھے معلوم نہیں کہ آئے یا نہیں،'' اس نے بے نیازی کے لہجے میں کہا۔

''نہیں اس کے بعد تو ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ سات برس گزر گئے۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ روز ہمارے گھر آتے تھے۔ ایسا لگتا تھا ہمارے ہی خاندان کے فرد ہیں۔ انسان کی زندگی بھی کیا ہے۔ کن کن راستوں سے ہم گذرتے ہیں اور ان میں کس طرح کھو جاتے ہیں،'' اجے نے سنجیدگی سے کہا۔

چند لمحے وہ خاموش بیٹھی رہی۔ پھر بولی، ''چائے پیو گے اجے؟ ابھی بنا کے لاتی ہوں۔ چائے پینے کی میری بھی خواہش ہو رہی ہے،'' اور وہ اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔

چائے سے زیادہ اسے تنہائی کی ضرورت تھی۔ کیتلی اسٹوو پر رکھ کر کھڑے کھڑے سوچتی رہی۔ ''کن کن راستوں سے ہم گذرتے ہیں اور ان میں کس طرح کھو جاتے ہیں۔ میں بھی تو کن کن راستوں سے گذری ہوں اور ان میں کس طرح کھو گئی ہوں۔ ایسا کیوں ہوا؟'' اس نے خود سے سوال کیا، لیکن اسے جواب نہیں ملا۔

اپنے خیالوں میں ڈوبی ہوئی وہ خاموش کھڑی تھی کہ چائے کی کیتلی کی سیٹی نے اسے چونکا دیا۔ وہ چائے بنا کر پیالیاں اور دوسرے لوازمات کشتی میں رکھ کر برآمدے میں اجے کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ دونوں بہن بھائی چائے پینے لگے۔

''دیدی کتنے دن بعد صرف ہم دونوں اس طرح بیٹھے چائے پی رہے ہیں،'' اجے نے اسے یاد دلایا۔ ''کیسے اچھے دن تھے وہ۔ لگتا تھا امتحان کے علاوہ دنیا میں کوئی فکر ہی نہیں ہے۔ کاش وہ زمانہ پھر واپس آ جائے۔''

''گئے دن پھر واپس نہیں آتے، بس ان کی یاد باقی رہ جاتی ہے،'' اس نے جواب دیا۔

''تم ٹھیک کہتی ہو۔ اچھا اب چلوں۔ موکل آتے ہی ہوں گے۔'' اور وہ کپ میز پر رکھ کر چلا گیا۔

وہ بیٹھی سوچتی رہی، ''آج اتنے دن بعد رتن نے کیوں فون کیا تھا۔ کیا سچ مچ وہ بابا کو دیکھنے آنا چاہتے ہیں؟''

کتنے برسوں بعد انہیں اجے کی شادی میں دیکھا تھا۔ اپنی بچی اور بیوی کو لے کر آئے تھے۔ بچی بالکل اپنے باپ کی ہم شکل ہے۔ انھوں نے اس کا نام نیتا رکھا ہے۔ میں نے سوچا تھا میرے نام سے اس قدر ملتا ہوا نام رکھ کر رتن نے عقلمندی نہیں کی۔ ان کی بیوی نے مجھے بڑے غور سے دیکھا تھا اور نمسکار کر کے خاموش کھڑی رہی تھی۔ وہ لوگ اجے سے رسمی باتیں کر کے چلے گئے تھے۔ اس کے بعد ہم کبھی نہیں ملے۔ نہ ان کا فون آیا اور نہ کہیں ملاقات ہوئی۔ مگر اچانک یہ فون کیوں آیا؟ پھر اس نے سوچا، ''شاید انہیں معلوم بھی نہیں تھا کہ میں آئی ہوئی ہوں''۔

دو دن گذر گئے۔ رتن کے فون کی بات اس کے ذہن میں تازہ ہی تھی کہ نوکر نے آ کر بتایا، ''چھوٹے بابو کے پاس رتن بابو آئے ہیں۔ صاحب سے ملنا چاہتے ہیں۔ کیا انہیں بلا لاؤں؟''

''کیا آپ ان سے ملیں گے؟'' اس نے اپنے والد سے پوچھا۔

''ہاں کیوں نہیں۔ آنے دو۔ برسوں ہوگئے اسے دیکھے ہوئے۔ آج وہ یہاں کہاں بھٹک نکلا،'' انھوں نے جواب دیا۔ تھوڑی دیر بعد رتن اور اجے دونوں آگئے۔

''آپ اب کیسے ہیں سر؟'' رتن نے ان کے پیر چھوتے ہوئے کہا۔

''ارے بھائی کیا کرتے ہو۔ پیر چھونا بہت پرانی بات ہے۔ اب اسے چھوڑ دینا چاہیے،'' انھوں نے کہا۔ ''آؤ بیٹھو، بہت دن ہوئے تم سے ملاقات نہیں ہوئی۔ میں تو بوڑھا آدمی ہوں اور پھر بیمار۔ کہیں نہیں آتا جاتا۔ لیکن جب کوئی آتا ہے تو مل کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔ میرے تو چل چلاؤ کا وقت آگیا۔ تم بتاؤ کیسے ہو۔''

''آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ ابھی تو آپ کو اجے کی بیٹی کی شادی کرنا ہے۔''

''ضرور ضرور!'' وہ ہنس کر بولے اور پھر بیتا کی طرف مخاطب ہو کر کہا، ''بھئی ان کے لیے چائے منگواؤ۔ میرے پرانے طالب علم ہیں۔ میں تو ان کو اپنا ہی سمجھتا ہوں، چاہے یہ مجھے چھوڑ دیں،'' انھوں نے شکایت کی۔

''نہیں سر یہ بات نہیں۔ میں دفتر کے کام میں بہت مشغول ہو گیا ہوں۔ پھر ایک عرصہ کے لیے لکھنؤ کے باہر اپائنٹمنٹ ہو گیا تھا۔ جب واپس آیا تو معلوم ہوا کہ آپ کی طبیعت خراب ہے۔''

چائے آگئی اور رتن نے پہلی بار بیتا کو غور سے دیکھا۔

''کیسی ہو بیتا؟ لندن کب واپس جاؤ گی؟ اس گندے اور غریب شہر میں وقت گزارنا تو بہت مشکل معلوم ہو رہا ہوگا،'' رتن نے طنزاً کہا۔

آپ بھول جاتے ہیں کہ یہ میرا بھی شہر ہے اور ہر سال گرمیوں کی چھٹیاں میں لکھنؤ میں ہی گذارتی ہوں۔''

''اچھا، یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ میں تو لکھنؤ سے باہر تھا۔ اب یہاں تبادلہ ہوا تو سنا کہ تم آئی ہوئی ہو۔ بڑا تعجب ہوا۔'' ان کے منھ سے نکل گیا۔ پھر وہ اسے بالکل ignore کرکے اجے اور اس کے والد کے ساتھ باتیں کرتے رہے۔

وہ خاموشی سے بیٹھی ان سب کی باتیں سنتی رہی۔ اس نے سوچا یہ اب بھی مجھ سے ایسا برتاؤ کر رہے ہیں جیسے میں بیس سال پہلے کی بیتا ہوں۔ پرانی عادتیں مشکل سے بدلتی ہیں۔ وہ یہ بھول گئی اس نے اسے کیسا دکھ دیا تھا۔ وہ سارے وعدے جو اس نے کیے تھے کتنی آسانی سے بھلا دیے تھے۔ وہ صرف یہ

سوچ رہی تھی کہ اس عمر میں بھی ان میں کتنی جاذبیت ہے۔ لمبا سا قد، سانولا رنگ، موٹے چشمے کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں۔ صرف ان کے کالے کالے گھنے بالوں میں جگہ جگہ سفیدی دوڑ گئی تھی۔

''لوگ کہتے ہیں ہینڈسم آدمی ادھیڑ عمر میں اور بھی خوش رو ہو جاتا ہے،'' اس نے سوچا۔

وقت تیزی سے گذر گیا۔ اجے سے رتن کہہ رہے تھے،'' اجے جس دوا کی ضرورت ہو فوراً مجھے اطلاع دینا۔ میں جانتا ہوں آج کل دواؤں میں کس قدر ملاوٹ ہوتی ہے۔ میں بہتر سے بہتر دوا کا انتظام کر دوں گا۔ آخر انہیں کی بدولت تو میں بنا ہوں۔ یہ میرے گھر کا نمبر ہے۔ اگر آفس میں فون کرنا چاہو تو اس extention پر فون کرنا۔'' پھر اپنا کارڈ میز پر رکھ کر انھوں نے رخصت لی اور اجے سے باتیں کرتے ہوئے وہ باہر چلے گئے۔

اس نے اپنے والد کی طرف دیکھا۔ وہ اب تھک گئے تھے اور آنکھیں بند کیے خاموشی سے لیٹے ہوئے تھے۔ شاید سو گئے ہیں، اس نے سوچا اور پھر کارڈ اٹھا کر غور سے پڑھا اور اسے پلنگ کے سرہانے رکھی ہوئی میز پر رکھ دیا۔

دن تیزی سے گزر گئے اور اس کے واپس جانے کا وقت قریب آ گیا۔ اس کے والد کی صحت اب پہلے سے بہتر تھی۔ اس دن صبح اٹھ کر اس نے ان سے کہا:

''بابا آج میں شاپنگ کے لیے جاؤں گی۔ کچھ کتابیں خریدنا ہیں۔ انیتا کے لیے بھی میں نے اب تک کچھ نہیں خریدا۔ وہ بہت ضروری ہے۔ دوستوں کے لیے بھی کچھ تحفے خریدنا چاہتی ہوں۔ خالی ہاتھ جاتے ہوئے برا لگتا ہے۔''

''ضرور جاؤ، اور میری طرف سے بھی اس کے لیے کوئی اچھا سا تحفہ خرید لانا۔ لیکن اکیلی ہی نہ جانا۔ کسی نوکر کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤ۔''

''بابا اب میں ۴۲ سال کی ہو گئی ہوں۔ لکھنؤ میرا اپنا شہر ہے۔ اکیلے جانے میں کیا حرج ہے؟ اور شاپنگ کے بعد اگر وقت ملا تو رانو سے بھی مل آؤں گی۔ ورنہ وہ شکایت کرے گی۔''

''جیسی تمھاری مرضی،'' انھوں نے آہستہ سے کہا اور اخبار پڑھنے لگے۔

کھانا کھا کر وہ بازار جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ اپنے لباس اور سنگھار پر آج اس نے معمول سے زیادہ توجہ دی تھی۔ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے اپنے اوپر تنقیدی نظر ڈالی۔

اس کا دبلا پتلا جسم اب بھر گیا تھا۔ آنکھوں کے قریب ہلکی ہلکی جھریاں تھیں۔ چہرے پر جوانی کا جوبن نہیں تھا۔ اس کی جگہ سنجیدگی اور وقار تھا۔ وہ کھڑی سوچتی رہی۔ ''میں کیوں آج رتن سے ملنے جارہی ہوں؟ کیا اپنی کھوئی ہوئی جوانی کی یادیں تازہ کرنے؟'' پھر اس نے سوچا، ''نہیں ان کا مجھ پر قرض ہے۔ جس طرح اپنے سارے وعدوں کو بھلا کر میں نے ان کو دکھ دیا ہے اس کا مجھے کوئی حق نہیں تھا۔ آج اس کے لیے ہی معافی مانگنا ہے۔''

''ٹیکسی آگئی ہے۔ بہو جی کہہ رہی ہیں میں آپ کے ساتھ بازار چلا جاؤں،'' بوڑھے مہاراج (باورچی) نے کہا۔

''نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں جانے کہاں کہاں جاؤں گی۔ اگر رانو گھر پر مل گئی تو بڑی دیر ہوجائے گی۔ تم گھر پر ہی رہو۔'' اور وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر مارکیٹ چلی گئی۔ وہاں ہمیشہ کی طرح بھیڑ بھاڑ تھی۔ بڑی جلدی اس کو چند چھوٹے چھوٹے تحفے مل گئے۔ پھر کتابوں کی دکان پر جا کر چند کتابیں خریدیں اور بل چکاتے ہوئے کیشیئر سے کہا، ''مجھے فون کرنا ہے۔ کیا آپ کے دفتر سے فون کرسکتی ہوں؟''

''جی ہاں کیوں نہیں۔ فون آفس میں ہے۔ وہیں چلی جایئے۔'' اس نے جواب دیا۔ وہ کئی بار اسے دیکھ چکا تھا اور جانتا تھا وہ برابر کتابیں خریدنے آتی ہے۔

آفس جا کر اجازت لینے کے بعد اس نے فون اٹھا کر نمبر ملایا۔ ایکسٹنشن ملنے کے بعد پوچھا، ''کیا رتن بابو بول رہے ہیں؟''

''ہاں بیتا، میں رتن بول رہا ہوں۔'' اس سے پہلے کہ وہ اپنا نام بتائے اسے جواب ملا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور لگتا تھا کہ گلا رندھ گیا ہے۔

''اگر آپ مصروف نہ ہوں تو میں تھوڑی دیر کے لیے آجاؤں۔''

''اگر مصروف بھی ہوتا تو بھی تمہارے لیے وقت نکال لیتا۔ لیکن اس وقت آفس میں اکیلے ہی کام کررہا ہوں۔ تم ضرور آؤ۔ میں تیسری منزل پر ہوں۔ میرے کمرے کا نمبر ۶۰ ہے۔ بالکل لفٹ کے سامنے۔ کب آرہی ہو تم؟'

''یہی آدھے گھنٹے میں،'' اس نے جواب دیا اور فون واپس رکھ کر قیمت ادا کرنے کے بعد وہ اپنی شاپنگ لیے ہوئے مارکیٹ سے باہر نکل گئی۔ ٹیکسی لے کر وہ جلد ہی رتن کے آفس میں پہنچ گئی۔

ان کے دروازے پر دستک دیتے ہی اسے جواب ملا، ''Come in'' دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوئی تو دیکھا کہ رتن کھڑکی کے پاس کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر جلدی سے اس کی طرف بڑھا اور اس کے قریب کی کرسی کھسکا کر اس نے کہا، ''آؤ بیٹھو۔ کیسی ہو؟ تھک گئی ہوگی۔ میں چائے منگواتا ہوں۔''

''نہیں چائے نہیں، ایک گلاس پانی ضرور منگوا دیجیے۔''

''آج بڑی گرمی ہے۔ تم ضرور تھک گئی ہوگی۔''

''گرمی تو ہے لیکن میں تھکی نہیں ہوں۔ صرف پیاس لگی ہے۔'' پھر اس کی میز پر فائلوں کے انبار کو دیکھتے ہوئے کہا، ''کیا بہت مصروف تھے آپ؟''

''مصروفیت تو رہتی ہی ہے۔ اگر کام نہ ہو تو یہ لوگ مجھے تنخواہ کیوں دیں گے اور اس کے بغیر گزارہ کیسے چلے گا۔ میں بیوی بچے والا آدمی جو ٹھہرا،'' اس نے ذرا ترشی سے کہا۔

بیرا ٹھنڈے پانی کے گلاس اور چائے رکھ کر چلا گیا۔ پانی کا گلاس جلدی سے ختم کرنے کے بعد اسے محسوس ہوا کہ اس کے دل کی دھڑکن اب کم ہوئی ہے۔

''چائے پیو،'' رتن نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

اس نے ان کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا۔ اس پر تعجب، خوشی یا ہیجان کا کوئی نشان نہیں تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ برابر اسی طرح ملنے آتی رہتی ہے۔ بیس سال کا طویل زمانہ ان کے درمیان میں نہیں آیا تھا۔ جو ہیجان اس کے دل میں تھا وہ شاید ان کے دل میں نہیں تھا۔

''اجے اور سر کیسے ہیں؟'' انھوں نے اس طرح پوچھا جیسے وہ محض ان کی شناسا تھی اور وہ اس کے خاندان کو اچھی طرح جانتے تھے۔

''اتنے عرصے بعد میرے آنے پر آپ کو کوئی تعجب نہیں ہوا؟''

تعجب کیوں نہ ہوتا۔ لیکن دل کہتا تھا ایک دن لندن جانے سے پہلے تم ضرور آؤ گی۔''

''آپ کو کیوں یقین تھا کہ میں ضرور آؤں گی؟''

''یقین تو میں نے اب کسی بھی بات پر کرنا چھوڑ دیا ہے لیکن کبھی کبھی انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ ایسا ہو اور کبھی کبھی وہ ہو بھی جاتا ہے۔'' انھوں نے اسی پرانی سادہ لوحی سے جواب دیا۔

وہ کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی، پھر بولی، ''کیا سچ آپ صرف بابا سے ملنے گئے تھے؟''

''تمہارا سوال غلط ہے۔ اگر تم نہ آتیں تو بھی میں پرنسپل صاحب سے ملنے ضرور جاتا۔ میں کئی

برس سے لکھنؤ سے باہر رہا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ اس قدر بیمار ہیں۔ لیکن جب سنا کہ تم بھی آئی ہو تو جلدی ہی ملنے چلا گیا۔'' اس نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا، اب بھی ان میں وہی Sincerety ہے، اسی طرح سچائی سے جواب دیتے ہیں۔ شاید ان کے کردار کا یہی رخ تھا جس میں میرے لیے اتنی جاذبیت تھی۔

''تم کیسی ہو بیتا۔ تمہاری بیٹی کیسی ہے؟ اڑتے اڑتے مجھ تک خبر پہنچی ہے کہ تم اپنے شوہر سے الگ ہوگئی ہو۔''

''جی،'' اس نے جذبات سے عاری لہجے میں جواب دیا۔ ''میں چاہتی ہوں کہ طلاق بھی ہوجائے لیکن جلدی کرنے کے لیے میں مقدمہ نہیں چلانا چاہتی۔''

وہ خاموشی سے اسے دیکھتے رہے۔ پھر ان کے ہونٹوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ آگئی۔

''آپ مسکرا کیوں رہے ہیں؟'' اس نے کسی قدر غصے سے کہا۔

''میں سوچ رہا تھا تم کس قدر بدل گئی ہو۔''

وہ خاموش رہی، پھر بولی، ''آپ بھی تو بدل گئے ہیں۔ بیس سال کا زمانہ بڑا طویل ہوتا ہے۔''

''ہاں ہم سب بدل گئے ہیں۔ لیکن دل چاہتا ہے تم ویسی ہی رہتیں۔''

دونوں چند منٹ خاموش بیٹھے رہے۔ ان کے پاس کہنے کو بہت کچھ تھا مگر وقت کی دیوار ان کے درمیان حائل ہوگئی تھی اور کوشش کے باوجود آج وہ اسے گرا نہیں سکتے تھے۔

وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ ''اب میں گھر چلوں۔ پانچ بج گئے ہیں۔ آپ سے صرف یہ کہنے آئی تھی کہ جو دکھ میں نے آپ کو دیا ہے اس کے لیے ہو سکے تو مجھے معاف کردیں۔'' اپنا کارڈ اس نے میز پر ان کے سامنے رکھ دیا۔ ''اگر آپ لندن آئیں اور ممکن ہو سکے تو مجھے اطلاع دیں۔''

اس سے پہلے کہ رتن کچھ کہہ سکیں وہ کمرے کے باہر نکل گئی۔ ٹیکسی اس کے گھر کی طرف چلی جارہی تھی۔ اس نے سوچا، ''یہ فرض بھی ایک دن ادا کرنا تھا۔'' لیکن اسے ایک خلا محسوس ہورہا تھا۔

اس کی باقی چھٹیاں تیزی سے گزر گئیں اور وہ لندن واپس آکر کالج کی مصروفیات میں گھر گئی۔ لیکن ہر ہفتے فون کرکے اپنے والد کی خیریت پوچھ لیتی تھی اور یہ معلوم کرکے کہ اب ان کی طبیعت پہلے سے بہتر ہے اسے بڑا سکون ہوا تھا۔

گھر کی یادیں اب اس کے ذہن میں دھیمی ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ اپنی زندگی کو پرانے محور پر واپس لے آئی تھی۔

اس دن شام کو وہ اسٹاف میٹنگ کے بعد بڑی دیر بعد واپس آئی تھی۔ دوپہر کی ڈاک سے آیا ہوا صرف ایک خط دروازے کے قریب پائدان پر پڑا ہوا تھا۔ وہ تحریر جلدی سے پہچان گئی۔ اس کی شادی کے بعد رتن نے یہ پہلا خط اسے لکھا تھا۔

آج بیس سال بعد بھی اس خط نے اس کے دل میں بڑا ہیجان برپا کر دیا۔ اس وقت وہ ۴۲ سال کی عورت، کالج کی سینیر لیکچرار اور جوان بیٹی کی ماں نہیں تھی۔ وہ ساری حقیقتیں بھول کر عمر کے اس حصے میں واپس چلی گئی تھی جسے عنفوان شباب کہتے ہیں۔

کوٹ اتار کر وہ کرسی پر بیٹھ گئی اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے خط کھول کر پڑھنا شروع کیا۔

خط بغیر کسی القاب کے شروع کیا گیا تھا اور آخر میں صرف رتن لکھا تھا۔

''میتا۔ شاید میں یہ خط کبھی نہ لکھتا، لیکن تمہاری تلخ ہنسی، تمہاری آنکھوں کی اداسی نے مجھے مجبور کر دیا۔ تمہیں یاد ہو یا نہ یاد ہو کہ تم کتنی معصوم تھیں، بالکل جوہی کی کلی کی طرح سادہ اور پاکیزہ۔ اسی لیے جب مجھے معلوم ہوا کہ تمہاری شادی ہوگئی ہے اور اپنے شوہر کے ساتھ اب لندن میں رہوگی تو مجھے محسوس ہوا کہ میری ساری دنیا اندھیری ہی نہیں ہوگئی ہے، مجھے کسی پر بھروسہ بھی نہیں رہا۔ اس زمانے میں میں نے ایک نظم لکھی تھی۔ وہ تو اس وقت یاد نہیں صرف اس کے چند بند یاد ہیں۔ لیکن اس کا مفہوم سن لو۔ ایک شخص پہاڑ کے پاس ایک چھوٹی سی کٹیا میں رہتا ہے۔ روز اپنی جھونپڑی سے باہر نکل کر پہاڑ کو دیکھتا ہے اور سوچتا ہے یہ پہاڑ کتنا بلند ہے۔ اس کے سبزہ زار کتنے دلکش ہوں گے۔ اس کی سب سے اونچی چوٹی کتنی پرشکوہ ہوگی۔ مگر میں تو ایک چھوٹی سی کٹیا میں رہتا ہوں۔ میری پہنچ تو وہاں تک کبھی نہیں ہو سکتی۔ مگر ایک دن ہمت کر کے پہاڑ پر چڑھنا شروع کر دیتا ہے اور جب سب سے اونچی چوٹی پر پہنچ جاتا ہے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ اس کا خیال کتنا غلط تھا۔ نیچے کھڑا کھڑا وہ جس پہاڑ کو اتنا بلند سمجھتا تھا وہ تو ایک پہاڑی تھا۔ اس کی وادیاں پر اسرار نہیں تھیں اور نہ اس کی چوٹیاں پرشکوہ۔ وہ سب تو اس کا فریب نظر تھا۔

''وہ نظم میں نے مایوسی اور غصے میں لکھی تھی۔ تم میرے لیے اس پہاڑ کی طرح تھیں۔ تم میرے کالج کے پرنسپل کی بیٹی تھیں۔ میں ایک چھوٹے سے گاؤں سے لکھنؤ پڑھنے آیا تھا۔ میں کالج

سے دور ایک ہوسٹل میں رہتا تھا اور بس میں لٹکتا ہوا کالج جاتا تھا۔ لیکن تم کو شوفر ڈرائیو کر کے تمہارے کالج لے جایا کرتا تھا۔ میں نے تمہارے بنگلے کے سامنے کھڑے ہوکر بارہا تم کو اپنی سہیلیوں کے ساتھ باہر جاتے دیکھا تھا۔ کم از کم میری نظر میں تو تم ایسی لگتی تھیں جیسے تاروں کے جھرمٹ میں چاند۔

''جب ہم پرنسپل صاحب سے یہ کہنے گئے کہ کالج کے سالانہ جلسے کے لیے ہم تم کو اسراج بجانے کی دعوت دینا چاہتے ہیں تو وہ فوراً راضی ہو گئے اور تم کو بلا کر انھوں نے ہم سب سے ملا دیا۔ یاد ہے جب ہم نے تم کو اور تمہاری دوستوں کو کافی ہاؤس چلنے کی دعوت دی تب بھی تم نے اور تمہارے والدین نے بڑی سادگی سے منظور کر لیا تھا۔ تمہاری ماں نے کتنی اُدارتا سے اپنے گھر کے دروازے میرے لیے کھول دیے تھے۔ میں انہیں ماسی ماں کہنے لگا اور یہ بھول گیا کہ میرا جنم ایک غریب گھر میں ہوا تھا اور نہ جانے کتنے خواب تمہارے ساتھ مل کر دیکھ ڈالے۔

''تمہارے والدین idealist قسم کے لوگ تھے۔ انھوں نے ملک کے دو ٹکڑے ہوتے دیکھے تھے۔ انھوں نے اپنا گھر دوار جانی پہچانی دنیا اور وہ رشتے جوان کو بہت پیارے تھے سب کھو دیے تھے لیکن انھوں نے ہار نہیں مانی تھی۔ انہیں یقین تھا کہ دیش کو آزادی ملنے سے پہلے جو خواب انھوں نے دیکھے تھے وہ ضرور پورے ہوں گے۔ یہ اعتماد ہم نے کھو دیا ہے لیکن ان کے من کی جوت جگ رہی تھی اور اسی جوت کی روشنی میں میں نے بھی اپنا مستقبل روشن کر لیا تھا۔

''تمہیں وہ دن یاد ہے جب ہم سب سے چھپ کر گومتی کے کنارے ٹہلنے نکل گئے تھے اور یکا یک پانی برسنے لگا تھا۔ ہم نے ایک چھپر کے نیچے پناہ لی تھی۔ ہم دونوں ہی کافی بھیگ گئے تھے اور تم سردی سے کانپ رہی تھیں۔ میں نے تم کو اپنی بانہوں میں لے لیا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چل رہے تھے لیکن ہمارے خون کی گرمی نے ہمارے جسم میں آگ سی لگا دی تھی۔ یہ ممکن تھا کہ ہم دونوں ہی جذبات کی امنگ میں آ کر کہاں سے کہاں چلے جاتے لیکن میں یہ جانتا تھا کہ پرنسپل صاحب اور ماسی ماں مجھ پر کتنا بھروسہ کرتے ہیں۔ تم کتنا اعتبار کر کے اس سنسان جگہ پر میرے ساتھ آئی تھیں۔ میں نے اپنی خواہشات کے ریلے کو روکنے کے لیے سوچا کہ تم ایک امانت ہو اور تمہاری حفاظت کرنا میرا فرض ہے۔ میں نے تمہارے چہرے، تمہارے لبوں اور آنکھوں پر بوسوں کی بارش کر دی تھی لیکن اس سے آگے ایک قدم اٹھانے کی میری ہمت نہیں تھی کیونکہ میں جانتا تھا کہ ذرا بھی اور آگے بڑھ کر

رک جانے کی طاقت مجھ میں نہیں تھی۔ میرا خیال ہے تمہارے دل میں بھی کچھ ایسا ہی طوفان آ رہا تھا۔ تم نڈھال ہو کر آنکھیں بند کیے میری گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی تھیں۔ میں نے چھپر کی طرف دیکھ کر کہا تھا،'' ہمارے سر پر یہ پہلی چھت ہے۔'' تم نے مجھ سے پوچھا تھا،'' کیا سچ مچ ہم ایک دن مل کر اپنا چھوٹا سا گھر بنائیں گے؟'' میں نے جواب دیا تھا'' یہ تو تم پر منحصر ہے۔'' تم سوچ رہی ہو گی آج بیس سال بعد میں یہ سب کیوں لکھ رہا ہوں لیکن میں نے اس عرصے میں بارہا سوچا ہے کہ اگر اس دن میں تم کو دل بھر کے پیار کر لیتا، ہمارے من کا ہی نہیں ہمارے جسموں کا بھی پورن ملن ہو جاتا تو تم کو میں نہ کھوتا۔ اس دن ہم جل (پانی) وایو (ہوا) اور اپنے جسموں کی اگنی (آگ) کی شاکسی (گواہی) دے کر اسی کٹیا کے نیچے خود ایک دوسرے کو گرہن (قبول) کر لیتے تو ہمیں کوئی الگ نہ کر سکتا۔ میں نے بارہا اپنے دل میں لگی ہوئی آگ کے لیے خود کو الزام دیا ہے۔ اگر میں بزدل نہ ہوتا تو تم کو اس طرح اکیلے جیون نہ بتانا پڑتا۔ اور نہیں تو کم از کم میں تمہاری یاد میں اپنی ساری زندگی بتا دیتا اور لوگوں کے زور دینے پر بیاہ نہ کرتا۔ میں نے اس غصے میں دس سال بتا دیے کہ لندن جانے کے ایک سال بعد تم نے ایک بدیسی سے پریم کر کے مجھے ہی نہیں اپنے ماں باپ اپنے دوستوں اور اپنے دیش کو بھی ٹھکرا دیا۔

''دس سال ہوئے اپنی ماں کے اصرار پر میں نے ایسی لڑکی سے شادی کی جو میرے اور تمہارے متعلق کچھ بھی نہیں جانتی تھی لیکن دھیرے دھیرے اسے سب کچھ معلوم ہو گیا۔ وہ یہ بھی جانتی ہے کہ وہ میری جیون ساتھی ہے لیکن وہ میرے ہردے (دل) میں کبھی پرویش (دخل) نہیں کر سکے گی جہاں صرف تمہاری ہی مورتی ہے۔ تم کہتی ہو کہ میں تم کو معاف کر دوں لیکن میں تو آج تک یہ بھی طے نہیں کر پایا کہ تم سے بچھڑنے کی ذمہ داری کس پر ہے۔ تم پر جس نے میرے پریم کو ٹھکرا دیا، مجھ بزدل پر یا اس inferiority complex پر جو مجھے ہمیشہ رہا ہے اور آج بھی ہے حالانکہ غریبی کے ان دنوں کی صرف یاد ہی باقی رہ گئی ہے۔

''میں نہیں جانتا کہ تمہارے دن کیسے بیتتے ہیں، تم اس ٹھنڈے دیس میں اندھیری اور ٹھنڈی شامیں اور راتیں کس طرح گزارتی ہو؟ کالج سے تھک کر آتی ہو تو تمہاری دیکھ بھال کون کرتا ہے؟

''سالوں بعد تم کو بس چند لمحوں کے لیے دیکھا تھا۔ میں تمہاری زندگی کے متعلق کچھ نہیں جانتا لیکن دل چاہتا ہے تم دکھی نہیں بلکہ سکھی رہو۔ اگر اس خواہش کو تم معافی سمجھ سکتی ہو تو میں نے تم کو

معاف کر دیا ہے۔

''رتن۔''

خط ختم کرنے کے بعد اسے گود میں رکھ کر وہ بڑی دیر تک خاموش بیٹھی رہی اور اس کے آنسو ٹپک ٹپک کر اس میں جذب ہوتے رہے لیکن اسے محسوس ہوا کہ وہ آنسو نہ دکھ کے تھے اور نہ سکھ کے۔ رتن کو دیکھنے کے بعد اس کے دل پر جو بوجھ تھا آج ہلکا ہو گیا تھا۔

اس کی زندگی میں محرومی نہیں تھی۔ اپنے شوہر سے علیحدگی کے بعد جو تلخی اس نے محسوس کی تھی، جو شک وشبہ اسے اپنے متعلق تھا اور جو دکھ اسے تھا وہ ان جذبات پر قابو پا چکی تھی۔ اب ان کی جگہ اس کے دل کی گہرائیوں میں شانتی کا انکور پھوٹ رہا تھا۔ اس کی زندگی خالی نہیں تھی۔ اس کی گڑیا جیسی بیٹی جوانی کی حدوں میں داخل ہو چکی تھی۔ جب وہ فون کرتی تھی تو اس کے کھنکھناتے ہوئے قہقہوں سے اس کی دنیا اجاگر ہو جاتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اسے کتنا پیار کرتی ہے۔ اس پر اسے کتنا فخر ہے۔ لیکن رتن کے خط نے اس کے وہ جذبات جگا دیے تھے جنہیں اس نے ایک عرصے سے اپنے دل کی گہرائیوں میں دفن کر دیا تھا اور سوچا تھا کہ اب ان میں کبھی جان نہیں آئے گی۔ لیکن وہ آج جیسے انگڑائی لے کر جاگ اٹھے تھے۔ برسوں کی گہری نیند کے بعد اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں لیکن اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بھی تھی۔ فون کی گھنٹی بج اٹھی اور چونک کر وہ جیسے ایک میٹھے سے خواب سے جاگ گئی۔

فون پر اس کی رفیق کار اور عزیز دوست اس سے شکایت کر رہی تھی۔ ''تم اتنی جلدی میٹنگ کے بعد کیوں چلی گئیں؟ ہم لوگوں نے طے کیا کہ تمہارے گھر کے پاس والے ریستوران میں کھانا کھائیں گے۔ وہیں سے بول رہی ہوں۔ تم بھی آجاؤ۔''

''آج نہیں ہیلن، مجھے گھر خط لکھنا ہے۔ کئی دن سے میں نے اپنے والد کو خط نہیں لکھا۔ وہ پریشان ہوں گے۔ تم تو جانتی ہو وہ کتنے بیمار تھے۔'' اور پھر چند ہلکی پھلکی باتوں کے بعد اس نے فون رکھ دیا اور مائکروویو اسٹوو میں کھانا گرم کر کے ٹیلی وژن کے سامنے بیٹھ کر کھانا کھاتے ہوئے شام کی خبریں سنتی رہی۔ اپنے باپ کو خط لکھنے کے بعد وہ شاور لے کر پلنگ میں لیٹ گئی اور ایک بار پھر رتن کا خط پڑھ کر اسے تکیے کے نیچے رکھ دیا اور سو گئی۔

دوسرے دن کالج جا کر کام میں مصروف ہو گئی۔ وہ لائبریری میں بیٹھی ہوئی اپنی کتاب کے

لیے ریسرچ کر رہی تھی کہ ہیلن بھی اس کے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔ چند ضروری باتوں کے بعد اس نے کہا، ''آج تمہارا چہرہ دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ تم کو کوئی بڑی اچھی خبر ملی ہے۔ میں بھی تو سنوں۔''

''کوئی بھی خاص خبر نہیں۔ بس فون آیا تھا کہ بابا کی طبیعت اب پہلے سے بہتر ہے،'' اس نے جواب دیا۔

لیکن وہ سوچتی رہی، ''کیا میرے دل کا حال میرے چہرے سے اس قدر صاف نظر آتا ہے؟'' شام کو گھر آ کر اس نے رتن کو خط لکھا۔

''ڈیر رتن

''خط کے لیے بہت بہت شکریہ۔ مجھے ہمیشہ سے معلوم تھا کہ تمہارا من کتنا اُدار (فراخ) ہے لیکن اس خط کو پڑھ کر محسوس ہوا کہ تمہاری ادارتا کی کوئی سیما (حد) نہیں ہے۔ سوچتی ہوں تم نے احساس کمتری کی بات کیوں لکھی ہے؟ میں نے اور میرے سارے خاندان نے تو ہمیشہ تمہارے گن اور تمہاری ادارتا ہی دیکھی ہے۔ تمہارا جنم غریب خاندان میں ہوا تھا یہ کانٹا سا کیوں تمہارے من میں کھٹکتا رہتا ہے؟ میری ماں نے تو مجھے یہی سکھایا تھا کہ ان فضول باتوں کو چھوڑ کر کسی بھی انسان کی شخصیت کو دیکھو اور سمجھو۔ انھوں نے خود بھی اس پر عمل کیا۔ تم اس کو ان کی ادارتا کہتے ہو۔ میں نے بھی تمہارے من کی ادارتا اور تمہاری غضب کی ذہانت، تمہاری سادگی کو دیکھا تھا لیکن لندن آ کر میری آنکھیں چکا چوند ہو گئی تھیں۔ بیس سال پہلے جب میں اس ملک میں آئی تھی تو میری عمر صرف ۲۲ سال تھی۔ مجھے اسکالرشپ ملنے پر ہم سب ہی کتنے خوش ہوئے تھے۔ تم بھی اس خوشی میں شریک تھے۔ لیکن چلتے وقت تم نے مجھ سے کہا تھا، ''وہاں جا کر مجھے بھول تو نہیں جاؤ گی؟'' اور میں نے کتنے بھروسے کتنے اعتماد سے کہا تھا: ''یہ کیسے ممکن ہے؟ تم یہ کس طرح سوچ بھی سکتے ہو؟'' تم خاموش ہو کر میری طرف دیکھتے رہے تھے۔ تم نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

''میں یہاں آنے کے excitement اور تیاریوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ میرے دل میں شک وشبے کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ ماں، بابا، بھائی اور تم کو چھوڑتے ہوئے دکھ ہوا تھا لیکن میں نے یہ کہہ کر اپنے من کو سمجھا لیا تھا کہ دو سال آنکھ بند کرتے گزر جائیں گے۔ تم بھی میرے خاندان کے ساتھ ایرپورٹ آئے تھے لیکن اس سے پہلے ہی ہم نے ایک دوسرے کو اکیلے میں دو سال کے لیے وداع دیدی تھی۔

''ہوائی جہاز میں بیٹھنے کے بعد جلدی ہی میرے آنسو رک گئے کیونکہ مجھے یقین تھا کہ میں جلدی ہی واپس چلی جاؤں گی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس دیس میں آ کر مجھے ایسا لگے گا جیسے میں آزاد پرندے کی طرح ہوں۔ ساری دنیا سارا آسمان میرا ہے۔ چاہوں تو اڑ کر کہیں بھی جاسکتی ہو۔ میں جانتی ہوں میرے ماں باپ نے ہمیشہ مجھے آزادی دی لیکن یہ آزادی دوسری ہی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جسے swinging sixties بھی کہتے ہیں۔اسی زمانے میں ڈیوڈ سے میری ملاقات ہوئی۔ میں یہاں Law کرنے آئی تھی۔ وہ Solicitor بن چکا تھا۔ ہم دونوں کا Subject ایک تھا شاید اسی لیے جلدی ہی ہماری دوستی ہوگئی۔ مجھے تعجب ہوتا ہے یہ دوستی کتنی تیزی سے محبت میں بدل گئی۔تم نے ڈیوڈ کو دیکھا نہیں وہ بڑا ہینڈسم آدمی ہے۔ نہ جانے کتنی لڑکیاں اس کے پیچھے لگی تھیں۔ وہ کتنی عورتوں کو اپنی پریمکا بنا چکا تھا۔ اس نے یہ سب مجھے بڑی صفائی سے بتادیا تھا۔ مجھے تعجب بھی ہوا کہ وہ کیوں میرے لیے اس طرح بے چین ہوگیا ہے۔ لیکن اس نے مجھے خود ہی بتایا کہ میری معصومیت اسے بڑی بھائی تھی۔ وہ اسی پر موہت تھا۔ ڈیوڈ جتنا تجربہ کار تھا میں اتنی ہی بدھوتھی۔ ڈیوڈ کو معلوم تھا کہ عورت کے دل میں کس طرح جگہ کی جاتی ہے اور مجھے اس سے پریم ہوگیا تھا۔ وہ پریم اس پریم سے بالکل الگ تھا جو مجھے تم سے تھا۔تم میرے ساتھی تھے۔تم بھی میری ہی طرح معصوم تھے لیکن ڈیوڈ میرا پریمی تھا۔ ہم بھول جاتے ہیں کہ عورت کے بھی جسم کی پکار ہوتی ہے۔اس کی بھی مانگ ہوتی ہے۔ اسے پورا کرنا اب اس دیس کے لوگوں کے لیے پاپ یا taboo نہیں ہے۔ جب میں یہاں آئی تھی یہ وہ زمانہ تھا جب سارے پرانے خیالات اور رکاوٹیں ٹکڑے ٹکڑے ہوکر بکھر گئی تھیں۔ ڈیوڈ نے مجھ سے ملنے کے بعد میرے دیس کے متعلق پڑھا اور اسے سمجھنے کی کوشش کی۔ آج میں سوچتی ہوں اس نے مجھ سے سچ مچ محبت کی تھی لیکن وہ زیادہ دن باقی نہیں رہی۔ انیتا کے پیدا ہونے کے تھوڑے ہی دن بعد میری شکل صورت، میری شخصیت اور تہذیب میں اسے برائیاں نظر آنے لگیں اور ہم ایک دوسرے سے دور ہوتے گئے اور دھیرے دھیرے ہمارا پریم جل کر راکھ بن گیا۔ ہم نے انیتا کی وجہ سے کوشش کی کہ اگر محبت کا رشتہ نہیں تو ہم دونوں میاں بیوی ہی بنے رہیں۔ اس کے بڑے ہوتے ہی ہم نے یہ رشتہ بھی توڑ دیا۔ میں یہ نہیں کہوں گی کہ مجھے دکھ نہیں ہوا۔ میں ہندو عورت ہوں۔ ڈیوڈ میرا شوہر تھا۔ اس رشتے کو توڑنا اس دیس میں بھی میرے لیے آسان نہیں تھا۔ لیکن اب دو سال ہوگئے، ہم ایک ودسرے سے الگ ہیں۔ انیتا ہوسٹل میں رہتی ہے۔ اپنی چھٹیاں باری باری ہم دونوں

کے ساتھ گذارتی ہے۔ میں لا کالج میں سینئر لیکچرار ہوں۔ اپنے کام میں مصروف ہوں۔ ایک کتاب چھپ چکی ہے، ایک اور لکھ رہی ہوں۔ بڑا من لگا کر اپنا کام کرتی ہوں۔ مجھے اپنے students اور colleagues دونوں کی ہی محبت اور عزت حاصل ہے اور سب سے زیادہ انیتا کی۔ وہ میری آنکھوں کا تارا ہے۔ اب میرے من میں ڈیوڈ کے لیے کوئی bitterness نہیں ہے۔ میں نے اکیلے رہنا سیکھ ہی نہیں لیا ہے بلکہ مجھے اپنی آزادی بہت عزیز ہے۔ تم شاید جانتے ہو اس ملک میں ہر تین شادیوں میں ایک طلاق پر ختم ہوتی ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ سارا خاندان بڑے دکھ بڑی مشکلوں سے بھی گذرتا ہے۔ طلاقیں تو ہمارے ملک میں ہو رہی ہیں۔ لیکن یہ سوچنا کہ آئندہ شادیاں نہیں ہوں گی یا طلاقیں نہیں ہوں گی غلط ہے۔ کم از کم مجھے تو اس کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔

''میں اپنے آپ کو ان خوش قسمت انسانوں میں شمار کرتی ہوں جنھوں نے ایک نئی زندگی شروع کی ہے جو کامیاب ہے۔ اس میں ایک ساتھی کی رفاقت تو نہیں لیکن اپنے مقصد کی لگن ہے۔ مجھ جیسی عورتیں ایک نئی زندگی کا پٹ کھول رہی ہیں۔ جنہیں موقعے مل رہے ہیں وہ آگے بڑھ رہی ہیں۔ کیا یہ کم ہے؟ میری شاموں، میری راتوں میں تنہائی ضرور ہے لیکن وہ خالی نہیں ہیں۔ تمہارے خط نے بھی ان کو نیا اجالا دیا ہے۔ دل چاہتا ہے کہ بیس سال پہلے لوٹ جاؤں اور وہ خواب جو ہم نے گومتی کے کنارے دیکھا تھا پورا ہو جائے۔ لیکن ہم دونوں جانتے ہیں یہ ممکن نہیں ہے۔ تمہاری بیوی ہے، بچی ہے اور میں بہت بدل گئی ہوں۔ اب ہمارا ملن کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں اس قابل نہیں ہوں کہ تم میری یاد اب بھی اپنے دل میں بسائے رہو۔ وہ زمانہ تو صرف ایک خواب سمجھو۔ تم نے اپنی بیوی کے متعلق لکھا ہے کہ وہ سب جانتی ہے، لیکن اسے یہ بھی بتا دو کہ تمہاری زندگی میں وہی سب سے اہم ہے۔ وہی تمہارے دکھ سکھ کی ساتھی ہے۔ میں تو صرف ایک یاد ہوں۔ میں بار بار آ کر تمہارا دروازہ نہیں کھٹکھٹاؤں گی۔

''میرا دل چاہتا ہے کہ اور کچھ نہیں تو کم از کم تمہارے خطوں کی ہی رفاقت مجھے مل جائے لیکن میں اب کبھی تم کو خط نہیں لکھوں گی کیونکہ یہ تمہاری بیوی سے بے انصافی ہوگی۔ میں تم کو تو دکھ دے چکی ہوں لیکن اب کالی پرچھائیں کی طرح اس کی بھی زندگی میں نہیں آؤں گی۔

''بیتا۔''

نقشِ دوست

ایڈمبرا کا گدلا گدلا آسمان گہرا سرمئی ہوگیا تھا اور بادل ایسے برس رہے تھے کہ جل تھل ایک کرنے کے بعد بھی بند ہونے کا نام نہیں لیں گے۔ میں اپنی چھتری گھر بھول آئی تھی اور بس کے اڈے پر کیو میں کھڑی ہوئی تھی جہاں بارش سے پناہ لینے کے لیے سر پر کوئی بھی سایہ نہیں تھا۔ پانی کی بوندیں میرے بالوں سے ٹپک ٹپک کر کپڑوں میں جذب ہورہی تھیں۔ مجھے ایسا محسوس ہورہا تھا کہ اس نئے اور اجنبی شہر میں میرا کوئی دوست کوئی سہارا نہیں ہے۔ ''میں یہاں کیوں آئی ہوں؟'' میں نے سوچا۔ مجھے اپنے اوپر ہی نہیں ساری دنیا پر غصہ آرہا تھا۔

''آپ بری طرح بھیگ رہی ہیں۔ آیئے میرے چھاتے کے نیچے آجایئے'' ایک گہری آواز نے مجھ سے کہا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک شخص بڑا سا سیاہ چھاتا لیے ہوئے بالکل میرے پیچھے کھڑا تھا اور مجھے اس کے نیچے پناہ لینے کے لیے مدعو کررہا تھا۔ میں نے اس کے چہرے، اس کی نیلی نیلی آنکھوں کو غور سے دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھیں۔ میں اس کے قریب آکر چھاتے کے نیچے کھڑی ہوگئی۔

اس نے مجھ سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ہم دونوں خاموش کھڑے رہے۔ جب میں بس میں سوار ہوئی تو بھی وہ میرے ساتھ تھا۔ بس رکی تو اتر کر میں اپنے فلیٹ کی طرف چل دی۔ بارش اب بھی شدت سے ہورہی تھی۔ مجھے تعجب ہوا کیونکہ وہ اب بھی میرے ساتھ چل رہا تھا۔ میرے کچھ پوچھے بغیر اس نے خود ہی کہا،'' چلیے میں آپ کو گھر تک پہنچادوں کیونکہ بارش اب اور بھی تیز ہوگئی ہے۔'' اس کے کھلے کھلے چہرے اور نرم آواز کے باوجود بھی میرے دل میں اس کے متعلق شبہ سا اٹھا۔ لیکن میرے سر پر چھاتا لگائے ہوے وہ میرے شانہ بشانہ چل رہا تھا۔ ''گھبرایئے نہیں، میں کوئی لفنگا نہیں ہوں۔ آپ کے فلیٹ کی عمارت کے سامنے ہی سڑک کے دوسری طرف رہتا ہوں۔ آپ کو بس اسٹاپ پر بارہا کھڑا دیکھا ہے۔ ہم پڑوسی ہیں اسی لیے سوچا آپ کو گھر تک چھوڑ آؤں'' اس نے بڑی سادگی سے میرے دل میں اٹھتے ہوئے سوالوں کا جواب دے دیا۔ میرے فلیٹ کے سامنے رک کر اس نے کہا،'' خدا حافظ۔ جایئے جلدی سے جاکر کپڑے بدل لیجیے۔'' نہ جانے کیسے میرے ہونٹوں

سے خود ہی خود نکل گیا،''جب تک بارش بند نہ ہو جائے آپ بھی میرے ہاں آ کر ایک پیالی چائے پی لیجیے۔''

''Are you Sure?،'' اس نے مجھ سے پوچھا۔

''بالکل،'' میں نے تیز تیز چلتے ہوتے ہوئے جواب دیا۔

بال سکھا کر جب میں کافی کے دو کپ لے کر کمرے میں داخل ہوئی تو وہ کھڑا ہوا آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میرے ہاتھ سے کافی لے کر سڑک کے اس پار کی عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا،''دیکھیے وہ ہے ہمارا فلیٹ۔ وہیں میں اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ رہتا ہوں۔ بالکنی سے میں نے آپ کو بس کا انتظار کرتے ہوئے دیکھا ہے۔''

اس کی باتوں سے میرے دل کے سارے شبہے مٹ گئے۔ کافی ختم کر کے وہ چلا گیا۔ لیکن چلتے چلتے اس نے مجھ سے پوچھا،''کیا آپ نئی نئی ہمارے شہر میں آئی ہیں؟''

میں نے کہا،''ہاں بالکل نو وارد ہوں۔''

''موسیقی پسند ہے؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔

''جی ہاں بہت،'' میں نے کہا۔

''اگر وقت ملے تو اگلے سنیچر کو میری دکان پر آجائیے۔ ہم آپ کو اپنے ساتھ ایک ہال میں لے جائیں گے جہاں ہم ہر مہینے ملتے ہیں۔ میں بھی لوک گیت گاتا ہوں۔'' اس نے اپنا کارڈ دیتے ہوئے کہا اور وہ میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد چلا گیا۔

نہ جانے مجھے کیوں محسوس ہوا کہ باہر کے اندھیرے بادل میرے کمرے میں آ گئے ہیں۔ اس کا کارڈ مینٹل پیس پر رکھ کر میں نے اسے بھولنے کی کوشش کی لیکن سنیچر کی صبح کو میرے دل میں ایک امنگ سی تھی اور شام کو میرے قدم اس کی دکان کی طرف اٹھ گئے۔

وہاں اسکاٹ لینڈ کی صنعت گری کے طرح طرح کے نمونے تو تھے ہی لیکن خاصا حصہ پوٹری (pottery) کے لیے بھی مخصوص تھا۔ وہ ایک خریدار سے لین دین میں مصروف تھا۔ لیکن اس کے چلے جانے کے بعد میری طرف مسکراتا ہوا آیا۔ میری خیریت پوچھ کر کہا،''مجھے امید تھی آپ ضرور آئیں گی۔'' پھر میرے ہاتھ میں اٹھائے گلدان کی طرف اشارہ کر کے بولا،''یہ میری بیوی کا بنایا ہوا ہے۔ خوبصورت ہے نا؟ وہ بڑی اچھی پوٹر ہے۔ کیا آپ اسے خریدنا چاہتی ہیں؟''

میں نے کہا، ''جی ہاں لیکن آج شام تو ہم کنسرٹ جا رہے ہیں۔''
''کوئی بات نہیں۔ کل میں خود ہی آپ کے گھر لے آؤں گا۔ میری بیوی بھی آج شام آرہی ہے۔'' مجھے احساس ہوا جیسے کسی نے میرے دل سے ایک چھوٹی سی روشنی کی کرن چرالی ہے۔

جلد ہی وہ بھی آگئی۔ وہ دراز قد کی گٹھے گٹھے بازوؤں، لمبے لمبے سنہرے بالوں والی عورت تھی۔ اس کے بڑے بڑے ہاتھ اور لمبی حساس انگلیاں دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ اگر وہ پوٹر نہ بھی ہوتی تو اسے ہونا چاہیے تھا۔ مجھ سے وہ بڑے اخلاق سے ملی۔ لیکن مجھے احساس ہوا کہ اس کی بھرپور زندگی میں مجھ سے دوستی کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی اور میں اس کے قریب نہیں آسکوں گی۔ مجھے اس خیال سے ناامیدی بھی نہیں ہوئی۔ موسیقی کی محفل ختم ہونے کے بعد میں ان کی ہی کار میں اپنے گھر چلی گئی۔ رخصت ہوتے ہوے اس کی بیوی نے رسمی انداز میں کہا، ''آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی، اور گلدان خریدنے کا شکریہ۔''

کار سے اتر کر میں ان کو اپنے گھر کی طرف جاتے ہوے دیکھتی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ زینے پر چڑھ کر اپنے فلیٹ میں چلی گئی۔ بٹن دبا کر میں نے کمرے میں روشنی کر دی لیکن میرے دل پر جو دھندلکا کہرے کی طرح چھایا ہوا تھا اس میں کوئی کمی نہیں آئی۔ رات دیر تک میں پلنگ پر لیٹے لیٹے پڑھتی رہی۔ نہ جانے کب نیند آئی۔ جب آنکھ کھلی تو صبح کی روشنی میں رات کی یادیں دھندلا گئی تھیں۔ میں بھی انہیں اجاگر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

ماں کی موت کے بعد لندن سے ایڈمبرا میں فرار کی تلاش میں آئی تھی۔ میرا رشتہ ان سے ماں اور بیٹی کا ہی نہیں تھا۔ ہم ایک دوسرے کے دوست بھی تھے۔ وہ ان عورتوں میں تھیں جو نرم گھاس کی طرح طوفان کے سامنے جھک جاتی ہیں اور اس کے گزر جانے کے بعد اسی طرح کھڑی ہو جاتی ہیں۔ یہ ایک عجیب سی طاقت ہوتی ہے، اسے محسوس ہی کیا جاتا ہے اس کا تجزیہ نہیں کیا جاسکتا۔ میرے باپ کے مرنے کے بعد انھوں نے ہی زندگی کی تلخ حقیقتوں کا سامنا کیا تھا اور ہماری زندگی پر کوئی سایہ نہیں پڑنے دیا تھا۔ پڑھائی ختم کر کے میں ہی ان کے پاس رہتی تھی۔ اس دن حسب معمول چائے کا کپ لے کر ان کے پاس گئی تو وہ اب تک سو رہی تھیں۔ میں نے جھک کر ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو ٹھنڈی تھی اور وہ ہمیشہ کی نیند سو چکی تھیں۔ ان کی اچانک موت نے مجھے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔ لندن سے، جہاں میرے لیے ہر طرف ان کی یادیں بکھری ہوئی تھیں، ایڈمبرا آ گئی تھی۔ وہاں میں کسی کو نہیں

جانتی تھی۔ صرف اسکول کے زمانے میں آئی تھی۔ پرنس اسٹریٹ، ایڈمبرا کاسل اور کھلے کھلے مرغزاروں کی یادیں میرے ذہن کے کسی گوشے میں محفوظ تھیں۔ اس لیے موقع ملتے ہی تبادلہ کروا کے آگئی تھی اور اب اپنے آپ کو بالکل اکیلا محسوس کررہی تھی۔ فلیٹ کے آس پاس پڑوسیوں سے بھی میری ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ میرے دل کے زخم ابھی تک ہرے تھے۔ میں نے ساری دنیا کے دروازے اپنے لیے بند کرلیے تھے لیکن وہ نہ جانے کیسے کسی چور دروازے سے اس میں داخل ہوگیا۔

یہ ہماری تیسری ملاقات تھی۔ وہ میرا گلدان لے کر آیا تھا۔ اسے مینٹل پیس پر رکھ کر میں اس کی خوبصورتی سے محظوظ ہورہی تھی۔ ایڈمبرا آنے ے بعد یہ پہلا تحفہ تھا جو میں اپنے لیے خریدا تھا۔ اسے دیکھ کر ایسی ہی خوشی کا احساس ہورہا تھا جو ہر انسان کو کسی خوبصورت چیز کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ وہ میرے قریب ہی کھڑا ہوا تھا۔ میری پشت پر ہاتھ رکھ کر اس نے دوستی کے لہجے میں کہا، ''مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ کو یہ پسند آیا۔''

''ہاں، بڑے دنوں بعد اپنے لیے یہ تحفہ خریدا ہے،'' شاید میرے لہجے اور میرے چہرے پر ان یادوں کی جھلک سی تھی جنہیں بھول کر میں نے رکتے رکتے زندگی کی طرف پہلا قدم اٹھایا تھا۔ اس نے اسے پہچان لیا اور ہماری دوستی ہوگئی۔

آہستہ آہستہ ہمارا معمول بن گیا کہ ہر ہفتے وہ ایک شام میرے ہی ساتھ گزارتا۔ اس کی بیوی اپنے بیٹے کو لے کر اپنی ماں کے پاس چلی جاتی تھی اور وہی شام ہم دونوں کی تھی۔ بارہا میں نے اس سے پوچھا، ''تمہیں احساس نہیں ہوتا کہ تم اپنی بیوی کے ساتھ بے انصافی کررہے ہو؟''

''نہیں، میں نے اس سے کبھی وعدہ نہیں کیا کہ اس کے علاوہ کسی سے محبت نہیں کروں گا۔''

میں نے کتنی بار خود سے سوال کیا: اس محبت کا انجام کیا ہوگا؟ کیونکہ مجھے واقعی اس سے محبت ہوگئی تھی اور وہ میری سونی سونی زندگی میں آکر ہر طرف چھاگئی تھی۔ مجھے محسوس ہوتا تھا جیسے میں اس غزال کی طرح ہوں جو ناف میں مشک چھپائے ہوئے اس کی خوشبو سے مست ہے۔ ایک عجیب سی کیفیت تھی، ایک عجیب سا احساسِ نشاط تھا۔

اس رات میں کسی تقریب سے واپس آرہی تھی۔ چاروں طرف چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ اپنے فلیٹ کی عمارت کے سامنے رک کر میں نے اس کے گھر کی طرف دیکھا۔ چاندنی کی روشنی میں نہائے ہوئے تین سائے اپنے گھر کی طرف جارہے تھے۔ ان کی پشت میری طرف تھی مگر میں انہیں پہچان

گئی۔ وہ درمیان میں تھا۔ وہی دراز قد، وہی ستواں جسم اور کالے کالے بالوں کا سر پر انبار۔ اس کی بھرے بھرے جسم والی بیوی اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے تھی اور اس کا بیٹا دوسری جانب تھا۔ اتنی دور سے صرف چاندنی کی روشنی میں مجھے احساس ہوا کہ وہ ایک دوسرے کے قریب ہی نہیں ایک دوسرے کا حصہ بھی ہیں اور ان کے درمیان میرے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس کے ساتھ گزارے ہوئے وہ لمحے جو میرے لیے اتنے قیمتی ہیں، اس کے لیے ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ سڑک کے اس پار کھڑے کھڑے میں نے سوچا، اس گنجان شہر میں میرا کوئی نہیں ہے۔ میں بالکل اکیلی ہوں۔ اور میرے قدم آہستہ آہستہ میرے سونے سونے فلیٹ کی طرف لے چلے۔

کمرے میں آکر میں نے کھڑکی کھول کر دیکھا تو چاند بادلوں میں چھپ گیا تھا۔ وہ تینوں اپنے گھر میں داخل ہو چکے تھے اور چاروں طرف سناٹا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ میں فیصلہ کر چکی ہوں کہ چند چرائے ہوئے لمحوں سے میں اپنی اکیلی دنیا نہیں بسا سکتی۔ دوسرے دن آفس جاکر میں نے چھٹی کی درخواست دے دی اور بکھرا ہوا سامان بٹول کر صندوقوں میں بند کر دیا لیکن فلیٹ کی اور چیزوں کے ساتھ اس کی بیوی کا بنایا ہوا گلدان بھی وہیں مینٹل پیس پر رکھا رہا۔

حسب معمول وہ مقررہ دن آیا۔ مجھے اپنے اوپر تعجب ہوا کہ باوجود اپنے فیصلے کے اسے دیکھ کر ہمیشہ کی طرح میرا دل خوشی سے معمور ہو گیا۔ اندر آکر اسے فلیٹ میں تبدیلی کا احساس ہوا۔ ''آج یہ بدلا بدلا کیوں لگ رہا ہے؟'' اس نے چاروں طرف نظر دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

''صفائی کی ہے،'' میں نے بات ٹالتے ہوئے کہا اور پھر ہم اسی طرح ایک دوسرے کی بانہوں میں کھو گئے۔ مجھے اس دن محسوس ہوا کہ ہر بار ایک ہفتے کی جدائی ہمیں ایک دوسرے کے اور بھی قریب لے آتی ہے۔ یہ خیال کہ چرائے ہوئے لمحے جلدی ہی گزر جائیں گے ہمارے ملن کی شدت کو اور بھی بڑھا دیتا ہے۔ میں نے سوچا، اب کبھی بھی ہم ایک دوسرے کو اپنی بانہوں میں نہیں جکڑیں گے۔ اس کے چہرے کے دلآویز مانوس نقوش میری آنکھیں کبھی نہیں دیکھیں گی۔ اس کے ستواں دراز جسم کا لمس میں کبھی بھی محسوس نہیں کروں گی۔ لیکن بجائے غم کے میرے سارے احساسات اور بھی شدید ہو گئے۔ میں دیر تک اس سے لپٹی ہوئی آنکھیں بند کیے لیٹی رہی۔ اس کے جسم کی خوشبو کو بھی میں اپنے ذہن میں محفوظ کرنا چاہتی تھی۔ پلنگ سے اٹھنے سے پہلے میری انگلیاں اس کے جسم کے نقوش چھوتی رہیں اور آنکھیں بند کیے وہ میرے لمس کی لذت سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

ایک لمحے کے لیے میرے ہونٹ اس کی بند آنکھوں کو چھو کر ہٹ گئے۔ یہ میرا آخری بوسہ تھا۔

جانے سے پہلے دروازے پر رک کر اس نے کہا، ''اگلے ہفتے تک کے لیے خدا حافظ!'' اور وہ چلا گیا۔ اپنی کھڑکی سے میری نگاہیں اس کا تعاقب کرتی رہیں جب تک وہ میری آنکھوں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔ اسی ہفتے میں ایڈمبرا چھوڑ کر لندن واپس آ گئی۔ میں نے اس کے لیے کوئی پیغام کوئی خط نہیں چھوڑا۔ میں جانتی تھی کہ ہم پر ایک دوسرے کا کوئی قرض کوئی ذمہ داری نہیں، اور چند الفاظ یا چند سطریں وہ سارے جذبات کیسے بیان کر سکتے تھے جو میرے سارے وجود پر چھا گئے تھے۔

میں دوبارہ لندن آ گئی۔ اسی گھر میں جہاں ہر ہر کونے میں میری ماں کی یادیں میرا انتظار کر رہی تھیں لیکن اب میں ان سے بھاگنا نہیں چاہتی تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ یادیں ہی تو ہماری زندگی کا ایسا سرمایہ ہیں جنہیں ہم سے کوئی چھین نہیں سکتا۔ ہم خود بھی نہیں۔

میں نے زندگی سے سمجھوتہ کر کے اپنا رفیق حیات بھی ڈھونڈ لیا۔ ایک زمانہ گزر گیا۔ میری تینوں بیٹیوں کی شادیاں ہو گئیں۔ سب سے چھوٹی کو رخصت کر کے مجھے محسوس ہوا کہ اپنے شوہر کی موجودگی کے باوجود اکیلی رہ گئی ہوں۔ مجھے اپنا ماحول بدلنے کی ضرورت تھی۔ برسوں بعد چند دن گزارنے کے لیے ایڈمبرا چلی گئی۔

اس دن میں پرنس اسٹریٹ کی طرف نکل گئی۔ میدانوں میں لوگ پرانے دنوں کی طرح گولف کھیل رہے تھے۔ رات کی بارش میں دھلا دھلا یا ایڈمبرا کاسل سورج کی روشنی میں جگمگا رہا تھا۔ ہر چیز نکھری نکھری اور نرم نرم دھوپ میں نہائی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا، ایسی رُت میں تو خواب بنے جاتے ہیں۔ کڑوی کسیلی یادوں کی جگہ یہاں کہاں ہے۔ چلتے چلتے میں اس چھوٹی سی گلی کی طرف مڑ گئی جہاں اس کی دکان تھی۔ اب بھی وہی پرانی وضع کا سائن بورڈ لگا ہوا تھا۔ دریچے کے پیچھے صنعت گری کے طرح طرح کے نمونے سجے ہوئے تھے۔ میں دکان میں داخل ہوئی تو دروازے میں لٹکی ہوئی گھنٹی بج اٹھی۔ کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے ہوئے شخص کو دیکھ کر میرے قدم زمین پر جم کر رہ گئے۔ مجھے احساس ہوا کہ وقت یہاں منجمد ہو کر رہ گیا ہے یا میں خواب دیکھ رہی ہوں۔ میں نے دیکھا وہی مسکراتی ہوئی آنکھیں، وہی کالے کالے بالوں کا انبار، وہی ہونٹوں کا خم اور وہی ستواں جسم جس سے میری انگلیاں واقف تھیں۔ ایک طویل لمحے کے بعد اس کے قریب جا کر میں نے پوچھا، ''کیا آپ کا نام پیٹر ہے؟''

اس نے جواب دیا، ''پیٹر میرے والد کا نام ہے۔ میرا نام ڈیوڈ ہے۔ کیا آپ انہیں جانتی

ہیں؟''

میں نے کہا،''ہاں بہت عرصہ ہوا جانتی تھی۔''

''وہ تو اب ریٹائر ہوگئے ہیں۔ یہاں بہت کم آتے ہیں۔''

اس کا بیٹا مجھے اس کے متعلق بتاتا رہا اور میں نظریں جمائے اس کے شگفتہ چہرے کو دیکھتی رہی۔ مجھے احساس ہوا یادوں کا اتھاہ سمندر پار کرکے اس کے متعلق جاننے اور اس سے ملنے کی میری کوئی خواہش نہیں ہے۔ وہ کہہ رہا تھا،''شاید آپ ایڈمبرا بہت دن بعد آئی ہیں۔ دکان میں کافی نئی نئی چیزیں ہیں۔ ادھر میری ماں کی بنائی ہوئی پوٹری کی چیزیں ہیں۔ شاید آپ کو کوئی چیز پسند آجائے۔''

جملہ ختم کرکے وہ دوسرے خریداروں کے پاس چلا گیا اور میں اس کونے میں چلی گئی جہاں شیشے کی شیلفز پر طرح طرح کے Pots رکھے ہوئے تھے۔ کھڑکی کے پاس ہی جھکی ہوئی شاخوں سے چھن چھن کر سورج کی کرنیں ان پر پڑ رہی تھیں۔ میں ایک نیلے گلدان کو دیکھ کر چونک پڑی۔ بالکل ویسا ہی جو میں نے پہلی بار یہیں سے خریدا تھا۔ میرے دل میں دبی دبی یادوں کا ایک یلغار سا اٹھا۔ میں نے ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے گلدان سے نظر اٹھا کر اس کے بیٹے کی طرف دیکھا جواب بھی خریداروں سے باتیں کررہا تھا۔ بجلی کی طرح میرے ذہن میں ایک خیال آیا: یہ میرا بھی تو ہوسکتا تھا۔ اور نہ جانے کیسے میری گرفت سے چھوٹ کر میری آنکھوں سے ایک بوند اس نیلے گلدان پر گرگئی۔

التجا

ہسپتال کے کشادہ باغ پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ خزاں بریدہ درختوں کی شاخیں برف کے شگوفوں کے بوجھ سے جھکی جارہی تھیں، جیسے راتوں رات چپکے سے آکر بہار وہاں خیمہ زن ہوگئی ہو اور نازک نازک چمیلی جیسے سفید پھول ہر طرف کھلا دیے ہوں۔ جگہ جگہ لان میں ان کے انباروں پر سورج کی کرنیں جگمگا رہی تھیں۔ اس کی کھڑکی کے سامنے کچھ فاصلے پر میری کا حسین مجسمہ سورج کی نئی نویلی روشنی میں نگینے کی طرح دمک رہا تھا۔ اپنے پلنگ پر لیٹے لیٹے بارہا اس نے اس کی خوبصورتی کو سراہا تھا۔ بارہا دل ہی دل میں اس سے باتیں کی تھیں۔ اسے محسوس ہوا تھا دور ہونے پر بھی وہ اس کے بہت قریب ہے۔ میری کا مسکراتا ہوا معصوم چہرہ کتنی بار اس نے خوابوں میں دیکھا تھا۔ جب درد کی شدت سے نجات دلانے کے لیے خواب آور دواؤں کے انجکشن کی مدد سے وہ اس دنیا میں پہنچ جاتی تھی جو ہوش اور مدہوشی کے درمیان تھی، اس حالت میں اس نے آہستہ آہستہ اس کا نام لے کر بارہا پکارا تھا، ''میری۔ میری کہاں ہو تم؟''

''میں تمہارے ہی پاس ہوں،'' اسے جواب ملا تھا اور اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تھا کہ وہ کم عمر خوبصورت نرس، جو نن بھی تھی، اس کا ہاتھ پکڑے بیٹھی تھی۔ میری کے مجسمے کی طرح وہ بھی نیلا لباس پہنے تھی۔ اس کے سر پر بندھا ہوا سفید رومال اس کے چہرے کی اردگرد نور کے ہالے کی طرح نظر آرہا تھا۔ وہ پھر نیند کے ساگر میں ڈوب گئی۔ •

اب صبح ہوگئی تھی۔ وہ بھی جاگ گئی تھی۔ نرسوں نے اس کا منہ ہاتھ دھلوا کر اور کپڑے بدلوا کر اسے تکیوں کے سہارے بٹھا دیا تھا۔ اس کی بیٹی کا لایا ہوا چھوٹا سا ٹیلی وژن اس کے سامنے میز پر رکھا تھا، اور صبح کی خبریں دکھائی جارہی تھیں۔ دور تک پھیلا ہوا ریگستان، بم گراتے ہوے ہوائی جہاز، غم سے تڑپتی ہوئی عورتوں کی، روتے ہوئے بچوں کی تصویریں۔ مشہور لوگوں کے جانے پہچانے چہرے جو کچھ کہہ رہے تھے لیکن وہ انہیں سن نہیں سکتی تھی کیونکہ زخمیوں اور تڑپتی ہوئی عورتوں اور بچوں کی آوازیں اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ وہ کمرے میں اکیلی ہی تھی لیکن اسے محسوس ہوا کہ ایک

ہجوم اس کے چاروں طرف ہے۔ اور وہ سب اس سے پوچھ رہے ہیں: ''کیوں؟ کیوں؟ یہ ظلم کیوں ہو رہا ہے ہم پر؟'' پھر ایک مشہور سیاست داں کا چہرہ ٹیلی وژن پر نظر آیا اور اس نے آہستہ سے اس سے پوچھا، ''یہ ظلم ان پر کیوں ہو رہا ہے؟'' مگر سیاست داں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے لب تیزی سے ہلتے رہے اور اس کے چہرے پر بے رحم مسکراہٹ منجمد ہو گئی۔

اس سے پہلے کہ خواب آور دواؤں کا اثر کم ہو جائے اسے پھر انجکشن دے دیا گیا تھا اور وہ خمار کے ہلکے ہلکے جھونکوں میں جھول رہی تھی۔ اس میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ ٹیلی وژن بند کر دے لیکن اس نے اپنی ساری قوت ارادی کے زور سے اپنی بند ہوتی آنکھوں کو کھول کر باغ میں استادہ میری کے مجسمے کو ایک بار پھر دیکھا تاکہ بڑھتی ہوئی نیند کے غلبے میں آ کر جب وہ سو جائے تو وہی حسین اور معصوم چہرہ اس کے خوابوں کو روشن کرتا رہے۔ اس لیے نہیں کہ وہ کیتھلک تھی یا میری کی پرستار۔ اس کا کوئی مذہب ہی نہیں تھا۔ مذہب سے اس کا رشتہ جو شروع سے ہی قائم نہیں ہوا تھا وہ کبھی بھی نہیں جڑ سکا تھا۔ اپنے باپ کے اشتراکی خیالات کی وجہ سے نہ وہ کبھی چرچ گئی اور نہ ہی اسکول میں صبح کے وقت سب کے ساتھ مل کر دعائیں مانگیں۔ کبھی کبھی اس کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ بھی اپنی ہم جماعتوں کے ساتھ مل کر ہمس (hymns) گا سکے کیونکہ موسیقی سے اسے بڑی الفت تھی جو اس کے گھر میں گونجتی رہتی تھی۔ اس کا باپ folk singer تھا وہ اور ان کے دوست مل کر ساری دنیا کے خوبصورت لوک گیت گاتے تھے اور اس کی ماں بھی ان کے ساتھ مل کر گاتی تھیں۔ ان کی آواز کیسی پیاری تھی۔ نیند کے خمار میں آج عرصہ بعد ان کا چہرہ اس کے سامنے آ گیا۔ گندمی سا رنگ، بڑی بڑی آنکھیں اور کالے کالے گھنگرالے بال۔ وہ اس کے قد آور خوبرو باپ کے ساتھ کھڑی ہوئی مسکرا رہی تھیں۔ لیکن اس کے ساتھ جانے پہچانے اور بھی عزیز چہرے اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہے تھے۔ اس نے سوچا خاکی وردی پہنے ہوئے یہ طرحدار جوان کیوں مجھے دیکھ کر اس طرح مسکرا رہا ہے۔ پھر اسے ایک دھکا سا لگا۔ یہ تو جارج ہے، میرا شوہر۔ پہلی بار جب اس سے ڈانس ہال میں ملاقات ہوئی تھی جب بھی مجھے دیکھ کر وہ اسی طرح مسکرایا تھا اور میں نے شرما کر آنکھیں جھکا لی تھیں۔ لیکن یہ تو میرے بیٹے نائجل سے بھی کم عمر ہے۔ یہ تو مجھ سے پانچ سال بڑا تھا، اس نے سوچا۔ پھر اس کی نظروں کے سامنے وہ تصویر آ گئی جو اب بھی اس کے پلنگ کے پاس والی میز پر رکھی ہوئی تھی، جسے اتنے طویل عرصے نے مدھم کر دیا تھا۔ اس کا سپیا رنگ اب زرد ہو گیا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ آہستہ آہستہ

وقت اسے بالکل مٹا ڈالے گا۔ لیکن آج کیسے اس تصویر کے رنگ جاگ اٹھے تھے۔ اس کی نیلی نیلی آنکھیں سنہرے گھنگھرالے بال اور سرخ مسکراتے ہوئے ہونٹ شاید اب بول پڑیں گے۔

''جارج تم نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔ تم نے تو کہا تھا کہ بہت جلد واپس آجاؤ گے۔ اتنے دن لگا دیے۔ میں تو تمہارا انتظار کرتے کرتے بوڑھی ہوگئی۔'' پھر وہ چہرہ جھک کر اس کے قریب آگیا۔

''جہاں میں ہوں وہاں ہر ایک جوان ہے۔ وہیں تمہیں اپنے ساتھ لے جانے آیا ہوں۔''

''تم کہاں ہو جارج؟ تم فرانس بھیجے گئے تھے۔ نارمنڈی۔ پھر وہاں سے پھر واپس نہیں آئے۔ بس خط آیا تھا کہ تم لاپتہ ہو اور...''

''میں لاپتہ نہیں ہوں نینا! نینا، آنکھیں کھولو!''

لیکن وہ آنکھیں کھولنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ آج اتنے دن بعد تو ملن ہوا ہے۔ اسے ڈر لگا کہ کہیں آنکھیں کھول کر وہ اسے کھو نہ دے۔

''نینا آنکھیں کھولو!'' پھر کسی نے اسے پکارا۔ اس نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ کھل ہی نہیں رہی تھیں۔ ''نینا فادر مائیکل آئے ہیں sacrament کے لیے۔ تمہارے ساتھ مل کر گناہوں کی معافی مانگنے کے لیے۔''

''گناہ؟'' اس نے آہستہ سے دہرایا۔ ''میں نے کیا گناہ کیا ہے؟ مجھے تو گناہ کرنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔'' اور پھر وہ خوابوں کی دنیا میں کھوگئی۔ اپنے بچپن کی طرف لوٹ گئی۔ یہ کون ہیں۔ یہ دبلے پتلے نڈھال فاقہ زدہ لوگ۔ ان کا یہ جلوس تو ختم ہی ہونے میں نہیں آتا۔

''یہ کہاں جارہے ہیں؟'' وہ اپنی ماں سے سوال کررہی تھی۔

''یہ ہنگر مارچر (Hunger marchers) ہیں۔ یہ غریب اور فاقہ زدہ مزدور ہیں۔''

''لیکن یہ مارچ کیوں کررہے ہیں؟''

''یہ اپنی غربت اور فاقہ زدگی کے لیے احتجاج کررہے ہیں۔''

لیکن میں نے تو کبھی اپنی غربت کے لیے کوئی احتجاج نہیں کیا۔ کیسے غریبی کے دن گزر گئے۔ جارج کی بیکاری کے زمانے میں بھی میں نے اپنے بچوں کو بھوکا نہیں سونے دیا۔ کتنی بار ماں کی دی ہوئی انگوٹھیاں گروی رکھنا پڑیں اور کسی طرح میں نے انہیں پھر چھڑا لیا کیونکہ وہی تو ہمارے اور فاقوں کے درمیان بار بار آجاتی تھیں۔ پھر جارج کو جنگ پر جانا پڑا اور میں چھوٹے چھوٹے تین بچوں کے

ساتھ اکیلی رہ گئی۔ بالکل اکیلی۔ کیسے دکھ کے دن تھے وہ۔ راتوں کو سائرن کی آواز کتنی خوفناک تھی۔ ہوائی جہازوں کے اڑنے کی آوازیں۔ بم گرنے کے دھماکے۔ گھر ایسے ہلتا تھا جیسے گرنے ہی والا ہے۔ میں اپنے بچوں کو لے کر تہہ خانے میں چلی جاتی تھی۔ اور وہ مجھ سے چمٹ کر کچھ دیر سہمے سہمے بیٹھے رہتے تھے اور پھر میری گود میں سو جاتے تھے۔ کیسی گہری نیند سو جاتے تھے وہ، جیسے انہیں یقین ہو کہ جب تک میں ان کے پاس ہوں انہیں کوئی ضرر نہیں پہنچ سکتا۔ ان کا یہ اعتماد میرے لیے کتنا بڑا سہارا تھا۔ اسی کے بل پر تو سب سہہ گئی۔ غربت، ہر طرف تباہی، موتیں، سب ہی سہہ گئی۔ کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ کسی نے نہیں جانا ہم پر کیا گزر گئی۔ جارج کے بعد وہ گھر جو ہم نے اپنی ساری پونجی جمع کر کے لیا تھا کتنا بڑا سہارا ہو گیا تھا۔ جنگ کے بعد کمروں میں کرائے دار رکھ کر میں نے اپنے اخراجات چلائے تھے۔ جارج کی پنشن سے سارے اخراجات کیسے چلتے۔ اسے یاد آیا زیادہ تر ان میں طالب علم تھے۔ کن کن ملکوں سے آئے تھے وہ۔ ان کی آنکھوں میں امیدوں کے دیے جل رہے تھے۔ ان میں سے چند چہرے اس کی زندگی کا جزو تھے۔ وہ نوجوان ہندوستانی لڑکی جو بری انداز میں اپنے بالوں کا جوڑا بنا کر اسے پھولوں سے سجاتی تھی اور خوبصورت ساڑی میں شہزادی معلوم ہوتی تھی۔ وہ دبلی پتلی ادھیڑ عورت جو اپنے بچوں کو چھوڑ کر ایک سال کے لیے پڑھنے آئی تھی۔ اس کے چہرے پر نہ جانے کن غموں کی داستان لکھی ہوئی تھی۔ ایسا لگتا تھا اس کا نحیف جسم لندن کی برف باری اور شدت کی سردی کو برداشت کر ہی نہیں سکے گا لیکن وہ بھی سب سہار گئی اور اس کے بھی جدائی کے دن ختم ہو گئے۔ وہ چلی تو گئی لیکن اس نے کبھی مجھے بھلایا نہیں۔ کرسمس کے دن اس کا کارڈ مجھے اس کی ہی نہیں ان سب کی یاد دلا جاتا ہے جو کتنے ملکوں سے آ کر میرے گھر میں بس گئے تھے۔ اور میرا رشتہ ساری دنیا سے ہی قائم ہو گیا۔ کس محبت سے انھوں نے مجھے بار بار بلایا مگر گھر چھوڑ کر میں کہاں جا سکتی تھی۔ چھوٹے چھوٹے بچے جو دن بدن بڑھ رہے تھے، ان کی ضروریات بڑھ رہی تھیں۔ کتنی بار میں نے سوچا تھا ان بے باپ کے بچوں کے ساتھ میں کیا انصاف کر سکوں گی۔ لیکن میرے بچے تو خود ہی ایک دوسرے کا سہارا بن گئے اور میرا بھی۔ نائجل تو جیسے ان کا ہی بچہ تھا۔ ہائے میرا نائجل جو جارج کی آخری نشانی تھا، جس نے اپنے باپ کو کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔

فرانس جانے سے پہلے جارج کس قدر مختصر وقفے کے لیے آیا تھا۔ اور چلنے سے پہلے جب اپنے بازوؤں میں جکڑ کر اس نے خدا حافظ کہا تھا تو میرا دل چاہا تھا وہ مجھے اسی طرح جکڑے رہیں۔

میں نے سوچا تھا میں ان کے سہارے سب سہہ جاؤں گی۔ لیکن اکیلے میں ساری ذمہ داریاں کیسے اٹھا سکوں گی۔ میں اپنے آپ کو کتنا کمزور محسوس کر رہی تھی جیسے بے پتوار کی ناؤ ہوں جسے طوفان میں چھوڑ دیا گیا ہو۔ لیکن سب سہہ گئی۔ نائجل کی موت بھی سہہ گئی۔ اسے بھی جنگ نے مجھ سے چھین لیا۔ اس بار آئر لینڈ میں میری امیدوں کا چراغ میرے دل کا سہارا میرا لال کسی چھپے ہوئے دشمن کی گولی کھا کر سو گیا۔ اس کا غم برداشت نہ کر پاتی اگر ان بچوں کا سہارا نہ ہوتا۔ میں نے ساری زندگی ان کے لیے وقف کر دی۔ چارہ ہی کیا تھا۔ میرا سوا ان کا کون تھا۔ اور یہ بھی تو دیکھتے دیکھتے پروان چڑھ گئے۔ اپنے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہیں۔ ان کی مصروفیات ہیں، ان کے پھول سے بچے ہیں۔ لیکن میں تو اکیلی رہ گئی۔ جدائی کے محرومیوں کے غم کسی طرح سہار لے گئی۔ لیکن اب تو دل ہی نہیں جسم بھی چھلنی ہو گیا ہے۔ اور اس کا مداوا کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں ... کچھ بھی نہیں۔

وہ نیند کی امنڈتی ہوئی لہروں کے نیچے کھو گئی۔ نہ جانے کتنی دیر وہ اسی طرح مدہوش رہی، پھر چونک کر اس نے دیکھا اس کے چاروں طرف میری ہی میری کے مجسمے ہیں۔ وہ میری جو نیلے لباس میں ملبوس تھی اور جس کے چہرے کے چاروں طرف نور کا حلقہ تھا۔ مسکراتی ہوئی سفید کوٹ میں سنہرے بالوں والی میری۔ اور وہ میری جس کا چہرہ اس کی بڑی بیٹی آنا کی طرح تھا جس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ جو اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھی۔ اور دور باغ میں جاڑوں کی سنہری دھوپ میں جگمگاتا ہوا میری کا مجسمہ۔

''میری،'' اس نے آہستہ سے پکارا۔

''ممی میں میری نہیں ہوں۔ میں تو آپ کی بیٹی آنا ہوں،'' اسے جواب ملا اور پھر وہ آواز سسکیوں میں ڈوب گئی۔

پھر سنہرے بالوں والی میری نے کہا، ''نینا میں آپ کو ایک اور انجکشن دے رہی ہوں تاکہ گہری نیند آجائے اور بالکل درد نہ ہو۔''

نیند اور بے ہوشی کے غلبے نے اس پر قابو پا لیا تھا۔

لیکن ایک بار پھر اس نے آنکھیں کھول کر اس میری کی طرف دیکھا جو نیلا لباس پہنے تھی اور اس کے چہرے کے چاروں طرف نور کا حلقہ سا تھا۔ میز پر ٹیلی وژن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آہستہ سے اس نے کہا، ''میری اسے بند کر دو۔''

''یہ تو بند ہے نینا،'' میری نے جواب دیا۔
''نہیں،'' اس کی آواز پہلے سے اونچی تھی۔ ''جو ہو رہا ہے اسے بند کر دو۔''
اس کی نظریں باغ میں استادہ مجسمہ کی طرف چلی گئیں۔ ان آنکھوں میں درد تھا۔ التجا تھی ان سے ایک آنسو ڈھلک کر تکیے میں جذب ہو گیا اور وہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گئیں۔

ننھی سی جانیں

یہ اس زمانے کی بات ہے جب ہندوستان اور پاکستان دونوں ایک ہی ملک تھے۔ کبھی کبھی فسادات ہوتے تو تھے لیکن کچھ عرصے بعد سب ہی ان کو بھول جاتے۔ جس اسکول میں ہم پڑھتے تھے وہاں مسلم لڑکیوں کی تعداد بہت کم تھی۔ زیادہ تر ہندو لڑکیاں تھیں۔ شانتی، رما، کشوری، رشیدہ، سب ایک دوسرے کی دوست تھیں۔ اس وقت ہم بچپن کے اس دور میں تھے جب مذہب دوستی میں حائل نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ ہمارے گھر کا ماحول بھی ایسا تھا کہ آنکھ کھول کر ہم نے نہ صرف اپنے رشتہ داروں کو دیکھا تھا بلکہ ہمارے والد کے دوستوں میں ہندو بھی شامل تھے۔ ان میں سے سب سے زیادہ مجھے بنواری لعل چاچا یاد ہیں۔ ان کی عمر میرے والد سے کافی کم تھی اور وہ میرے والد کو بھائی صاحب اور میری ماں کو بھابی کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ میرے والد سات بہنوں میں اکیلے بھائی تھے۔ شاید اس لیے وہ میرے والد کے چھوٹے بھائی اور والدہ کے دیور کی جگہ تھے۔ اور اسی طرح ان سے مذاق کا رشتہ تھا۔ بنواری لعل چچا طبعاً بڑے خوش مزاج انسان تھے۔ جب وہ آتے تو گھر میں چہل پہل سی ہو جاتی۔

میری والدہ میرے والد کے سارے دوستوں سے پردہ کرتی تھیں لیکن سنا ہے جب میرے والدین کی شادی ہوئی تو بنواری لعل چاچا کی عمر کم ہی تھی اور جس دن میری والدہ رخصت ہو کر آئیں اس دن سے ان سے اس محبت سے ملے تھے کہ پردہ کرنے کا خیال انہیں کبھی آیا ہی نہیں۔ ویسے بھی محلے کے لڑکے تھے، بچپن سے گھر میں آتے جاتے تھے۔ خاندان کی ساری عورتیں ان سے مانوس تھیں۔ لیکن اب وہ جوان ہو چکے تھے اور وکیل تھے۔ ان کی شادی ہو چکی تھی اور بڑی کامیاب پریکٹس تھی۔ لیکن ان کا ہم سب کے ساتھ سلوک بدلا نہیں تھا۔ جب وہ گھر آتے تو سب سے پہلے میری والدہ سے فرمائش ہوتی، ''بھابی پان کھلوایئے۔ آپ کے ہاتھ کے پان کا مزہ ہی اور ہوتا ہے۔'' پھر ہم سب بچوں کے ساتھ بچہ ہو کر کھیلتے۔ انہیں ہر ایک کے دل میں جگہ کرنے کا گر آتا تھا۔

ان کی شادی کم عمری میں ہی ان کی والدہ کے اصرار سے ان کے قریب کے گاؤں کے

زمیندار کی اکلوتی بیٹی سے ہوگئی تھی۔ اور جب وہ رخصت ہوکر گھر آئیں تو ہمیں احساس ہوا کہ بنواری لعل چچا کی طرح وہ بھی سب کے دل میں جگہ کرنے کا راز جانتی ہیں۔ بنواری لعل چچا دراز قد اور سانولے رنگ کے جوان تھے اور ان کی بیوی چھوٹے سے قد کی گوری چٹی بڑی بڑی آنکھوں والی لڑکی تھیں۔ ان کا بڑا خوبصورت باغ تھا جہاں بنواری لعل چچا ہمیں اپنی ٹم ٹم میں بٹھا کر آم اور خربوزے کھلانے اور برسات میں جھولا جھلوانے اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ ہوتا یہ تھا کہ کبھی کبھی بنواری لعل چچا کچہری سے کام ختم کر کے کشوری چاچی کے ساتھ ہمارے گھر رکتے ہوئے ہمیں لے کر اپنے باغ میں چلے جاتے اور ہم وہاں باغ میں جھولا جھولتے یا پیڑوں کے گھنے جھنڈ میں آنکھ مچولی کھیلتے۔ ہم بھائی بہنوں کے علاوہ اور بچے بھی جو باغ کے پاس رہتے تھے آجاتے تھے۔

باغ کے درمیان میں ایک انگریزی طرز کا چھوٹا سا بنگلہ تھا۔ دو تین چھوٹے چھوٹے کمرے، باورچی خانہ، غسل خانہ اور ان کے چاروں طرف کشادہ برآمدہ جہاں طرح طرح کے پیڑوں اور پودوں کے گملے سجے ہوے تھے اور برآمدے کے چاروں طرف پھولوں کی کیاریاں تھیں جن میں لگی ہوئی جوہی، چمیلی اور عشق پیچاں کی بیلیں بنگلے کی دیواروں سے بڑھ کر اس کی پھونس کی چھت پر پھیلی ہوئی تھیں۔ مجھے اب بھی یاد ہے ان میں بیوں اور درزی چڑیا نے اپنے گھونسلے بنا لیے تھے۔ ان گھونسلوں کو چھونے کی کسی کو اجازت نہیں تھی۔ یہ خاص طور پر کشوری چاچی کی ہدایت تھی۔ بارہا گھونسلوں کے پاس دانہ ڈالنے کے بعد ہم ان کے ساتھ بڑی خاموشی سے برآمدے میں بیٹھ جاتے اور بیوں اور درزی چڑیاؤں کو ان کے گھونسلوں سے نکل کر دانہ چگتے ہوے دیکھتے۔ یا شام کو دور مغرب میں سورج غروب ہوتے وقت جب مالی گملوں میں پانی ڈالنے آتے تو چکنے چکنے پتوں پر پڑتی ہوئی بوندیں موتی بن کر بکھر جاتیں۔ سورج کی روشنی میں ان موتیوں کی تصویر اب بھی میری بچپن کی یادوں میں محفوظ ہے۔ انہیں یادوں میں دو چھوٹے چھوٹے بکری کے بچوں کی یاد بھی شامل ہے۔

ہوا یہ کہ بنواری لعل چاچا کے گاؤں سے کوئی کسان دو چھوٹے چھوٹے بکری کے بچے بیچنے آیا تھا۔ اس وقت میرے والد بھی بنواری لعل چاچا کے یہاں موجود تھے۔ بنواری چاچا نے میرے والد سے کہا، ''بھائی صاحب آپ ان کو لے لیجیے۔ آپ کے باغ میں رہیں گے۔ کھا پی کر ایک سال میں بڑے ہو جائیں گے اور بقرعید کی قربانی کے وقت کام آجائیں گے۔'' میرے والد کو یہ رائے پسند آگئی اور بکری کے بچے ہمارے باغ میں لا کر اس حصّے میں باندھ دیے گئے جہاں ٹم ٹم کا گھوڑا، بیل اور گائے

بندھتے تھے۔ بکری کے بچے ابھی بہت چھوٹے تھے۔ پہلے تو شاید اپنی ماں کی یاد میں زور زور سے منمناتے رہے، جیسے اسے بلا رہے ہوں۔ پھر تھک ایک دوسرے سے لپٹ کر سو جاتے تو ایسے پیارے لگتے۔ کچھ دن بعد ہم لوگوں سے مانوس ہو گئے اور ہمارے پیچھے پیچھے اس طرح بھاگتے جیسے ہرن کے بچے ہوں۔ باغ سے لا لا کر گھاس پتیاں اور اپنے حصے کی مونگ پھلیاں کھلانا ہم لوگوں کا معمول بن گیا۔ اور وہ ہم لوگوں کو دیکھ کر اس طرح ''میں میں'' کرتے ہوئے ہمارے پیچھے بھاگتے تھے جیسے ہمارے دوست ہوں۔ دیکھتے دیکھتے وقت گزر گیا، وہ خوب بڑے ہو گئے۔ لیکن ہم بچوں کو دیکھ کر وہ اسی طرح ''میں میں'' کر کے ہمارے ساتھ بھاگنے کی کوشش کرتے۔ اسی زمانے میں ہمارے کانوں میں بھنک پڑی کہ بقر عید پر ان کی قربانی ہوگی۔

ہم نے جب اپنی والدہ سے پوچھا تو انھوں نے صاف صاف جواب تو نہیں دیا لیکن حضرت ابراہیم اور ان کے بیٹے اسمٰعیل کا قصہ سنا دیا کہ کس طرح وہ اپنے بیٹے کو قربان کرنے کے لیے تیار ہو گئے تھے، لیکن عین وقت پر خدا کے حکم سے وہ بچ گئے اور حضرت ابراہیم اپنے قول کے سچے ثابت ہوئے۔ اسی سے مسلمان ہر سال قربانی دیتے ہیں۔ پھر کہا، ''دو بکری کے بچوں کی کیا اہمیت ہے۔'' لیکن یہ نہیں بتایا کہ وہ قربان کیے جائیں گے یا نہیں۔

بقر عید کا دن آیا اور ہم نئے نئے کپڑے پہنے ہوئے امی کے کہنے پر خالہ کے یہاں عید کا سلام کرنے بھیج دیے گئے۔ جب وہاں سے واپس آئے تو دیکھا کہ باورچی خانے میں بہت سا گوشت رکھا ہوا ہے اور ہماری والدہ باورچی کو ہدایت دے رہی ہیں کہ کون سا گوشت کس کے ہاں جائے گا اور کس گوشت کا قورمہ پکے گا اور کون گوشت پلاؤ کے لیے استعمال کیا جائے گا۔

ہمارا باغ ہمارے گھر سے بہت دور تھا اس لیے کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ ہم معلوم کر سکتے کہ وہ گوشت جو بڑی بڑی سینیوں میں رکھا ہے کسی اور بکروں کا تھا یا ہمارے عزیز بکروں کا۔ پھر بھی دل میں ایک کھٹک سی ہو گئی۔ اس لیے ہم نے موقع ملنے پر باورچی سے دریافت کیا، ''بندو خاں، کیا یہ گوشت ان بکروں کا ہے جو باغ میں پلے ہوئے تھے؟''

بندو بولے، ''کون جانے بٹیا کون سا گوشت کس بکرے کا ہے۔ کتنا گوشت باہر سے آیا ہے اور کتنا گوشت باہر جا رہا ہے۔ اب آپ لوگ باورچی خانے سے باہر جاؤ، آج ہمیں بڑا کام ہے۔'' پھر اپنے نیچے کام کرنے والے لڑکے سے بولے، ''ابے لونڈے بیٹھا بیٹھا میرا منہ کیا دیکھ رہا ہے۔ چل

برتن مانجھ ڈال، پھر مصالحہ پیسنا شروع کر دے۔ ڈھیروں کام پڑا ہے۔''

بوا کے پاس گئے تو انھوں نے ہمارے سوال کا جواب نہیں دیا۔ پوچھنے لگیں۔ ''خالہ نے کیا عیدی دی اور ان کے یہاں کون کون آیا تھا'' وغیرہ وغیرہ۔

کسی سے اطمینان بخش جواب نہیں ملا۔ باہر مردانے میں ابا اپنے دوستوں کے ساتھ باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ پھر ہم بھی اور کاموں میں مصروف ہو گئے۔

دوسرے دن اتوار تھا۔ عام طور پر اس دن ہم اپنے ابا جی کے ساتھ باغ جایا کرتے تھے۔ اس اتوار کو بھی جب ابا گاڑی میں بیٹھ کر باغ جانے کو تیار ہوئے تو ہم نے بھی ان کے ساتھ جانے کی فرمائش کی۔ لیکن ایسا محسوس ہوا کہ وہ ہمیں لے جاتے ہوئے جھجک سی محسوس کر رہے تھے۔

کہنے لگے، ''آج میں زیادہ دیر باغ میں رکوں گا نہیں، تم لوگ کسی اور دن جانا۔''

ہم نے کہا، ''ابا جی ہم بھی آپ کے ساتھ جلدی ہی چلے آئیں گے۔ وہاں ٹھہرنے کے لیے ضد نہیں کریں گے۔''

وہ کچھ لاجواب سے ہو گئے۔ بولے، ''جاؤ اپنی امی سے پوچھ آؤ۔'' امی نصیبن بوا کو کسی بات پر ڈانٹ رہی تھیں۔ بولیں، ''جاؤ میرا دماغ خراب نہ کرو۔''

ہم نے ابا سے جا کر کہہ دیا، ''جی ہاں انھوں نے اجازت دے دی۔'' اور ہم ان کے ساتھ باغ پہنچ گئے۔ گاڑی سے اترتے ہی ہم اس طرف بھاگے جہاں جانوروں کا باڑا تھا۔ گھوڑا، گائے اور بکری کے بچے بندھے رہتے تھے جو ہمیں دیکھتے ہی ''میں میں'' کرتے بھاگنے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن آج وہ خالی خالی تھا۔ گائے ناند کے پاس بیٹھی جگالی کر رہی تھی۔ اور بکروں کا کھونٹا خالی تھا۔ منگلو مالی بیٹھا بیٹھا کٹی کاٹ رہا تھا۔

ہم نے کہا، ''منگلو بکری کے بچے کہاں گئے؟''

اس نے ہاتھ روک لیا۔ پھر ہماری طرف دیکھ کر بولا، ''ان کی تو قربانی ہو گئی، تمھیں معلوم نہیں؟'' پھر بولا، ''تم لوگ دور ہٹ کر کھڑے ہو۔ کہیں آنکھ وانکھ میں کٹی نہ پڑ جائے۔'' اور پھر کٹی کاٹنے میں مشغول ہو گیا۔

ہم بھاگتے ہوئے پیڑوں کے جھنڈ کی طرف چلے گئے۔ میرے بھائی نے جیب سے مونگ پھلیاں نکال کر انہیں دیکھتے ہوئے اس طرح کہا جیسے یہ کوئی بڑا مسئلہ ہے، ''میں تو مونگ پھلیاں ان

کے لیے لایا تھا۔ اب کیا کروں ان کا؟'' اس کی آواز رندھی رندھی تھی۔ لیکن بجائے ہمدردی ظاہر کرنے کے میں نے اس سے چڑ کر کہا جیسے بکری کے بچوں کی قربانی اس کا ہی قصور ہو، ''خود ہی کھا جاؤ، تم تو پیٹو ہو!''

اس نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا جیسے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اس سے خوامخواہ کیوں ناراض ہوں۔ پھر مونگ پھلیاں اس نے زمین پر گرادیں اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا ابا جی کے پاس چلا گیا۔

میری بڑی بہن کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ بولیں، ''ابا سے کہیں گے اب کبھی بکری کے بچے ہم نہیں پالیں گے۔'' چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ نیم کے گھنے گھنے پیڑوں سے چھن چھن کر روشنی کی جالی سی پتوں اور نبولیوں سے ڈھکی ہوئی زمین پر پڑ رہی تھی۔ ہر طرف سکون تھا لیکن مجھے محسوس ہوا جیسے ہر چیز خاموش ہوگئی ہے۔ صرف کٹی کاٹنے کی آواز خاموشی اور سکوت کو کاٹتی ہوئی ہمارے پاس آ رہی تھی۔ کھٹ کھٹ کھٹ...

برسات کا موسم ختم ہو چکا تھا۔ ہوا میں بڑی خوشگوار خنکی آ چکی تھی۔ اس دن اتوار کا دن تھا۔ حسب معمول ابا جی صبح اٹھ کر باغ جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ ہم بھی ان کے ساتھ صبح صبح باغ چلے جاتے تھے۔ اپنی عادت کے مطابق وہ باغبانی میں مشغول ہوگئے لیکن ہم کچھ بے مصرف سے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ پہلے اس طرف چلے گئے جہاں نہانے کے حوض کے پاس کی کھائی میں کیلے کے پیڑوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ ان کے چکنے چکنے ریشم جیسے پتوں پر اوس کی بوندیں اب بھی تھرتھرا رہی تھیں اور چھوٹے چھوٹے کیلے اپنے لال خولوں کے نیچے سے جھانک رہے تھے۔ پانی نالیوں اور حوضوں سے ہوتا ہوا کل کل کرکے ان کی جڑوں میں جذب ہو رہا تھا۔ باغ کے بالکل آخر میں یوکیلپٹس کے بڑے بڑے قد آور درختوں کی قطاروں سے چھن چھن کر صبح کی روشنی گلابوں کے تختوں پر پڑ رہی تھی۔ وہاں سے نکل کر ہم اس حصے میں چلے گئے جہاں انگور کی بیلوں کو بانس کی جالی پر چڑھا کر بڑا کشادہ کنج (کمرہ) بنا دیا گیا تھا اور اس کی چھت سے چھوٹے چھوٹے انگوروں کے خوشے لٹک رہے تھے۔ انگور ابھی تک پکے نہیں تھے اور انہیں توڑنے کی ہمیں اجازت نہیں تھی۔ پھر بھی سب کی آنکھ بچا کر میرے بھائی نے ایک انگور توڑ کر اپنے منہ میں رکھ لیا۔ ''پیٹو ہو ناں!'' آپا نے اس کی طرف غصے سے دیکھ کر کہا۔ ''دیکھنا کیسی ڈانٹ پڑے گی۔''

''کون پیٹو ہے؟'' بنواری لعل چاچا نے انگور کی بیلوں والے کنج میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔
انہیں دیکھ کر ہم سب کو احساس ہوا جیسے کوئی ساتھی یا ہمارا لیڈر آ گیا ہے اور اب مزہ آئے گا۔
آپا نے میرے بھائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''یہ!''
بنواری لعل چاچا ہنس کر بولے، ''ارے بھائی یہ تو ہم سب جانتے ہیں۔ چلو پیٹو تمھیں اپنے ساتھ لے چلیں۔ تم سب کو بھی۔ کل رات گائے کا بچھڑا ہوا ہے، اسے بھی دیکھ آؤ۔ تمہاری چاچی باغ ہی میں تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔''
بنواری لعل چاچا کا باغ ہمارے باغ سے دور نہیں تھا، ہم ٹہلتے ہوئے وہاں جلدی ہی پہنچ گئے۔ باغ کے پھاٹک سے داخل ہو کر ہم بنگلے کی طرف دوڑتے ہوئے چلے گئے جہاں کشوری چاچی ہمارا انتظار کر رہی تھیں۔ وہ لال کنارے کی چمپئی ساڑی پہنے تھیں۔ ان کی مانگ میں سیندور اور ماتھے پر لال ٹیکا دمک رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا وہ پوجا کر کے اٹھی ہیں۔ ہمیں دیکھ کر انھوں نے پاس رکھی ہوئی پیتل کی چمچماتی ہوئی تھالی اٹھالی جس میں کیلے کے پتے پر پیلے پیلے بوندی کے لڈو اور دہی رکھا تھا۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹی سی ڈبیا میں سیندور اور اس کے پاس ہی گیندے کے پھولوں کا ایک چھوٹا سا ڈھیر لگا تھا۔ وہ بولیں، ''چلو تم بھی گائے کا بچھڑا دیکھ لو۔ کل رات ہی ہوا ہے۔ بڑا منا سا ہے۔ ابھی تو بڑی مشکل سے کھڑا ہو سکتا ہے۔ پھر آ کر پےاولی (۱) اور مٹھائی کھانا۔''
پھر وہ تھالی اٹھا کر اس طرف چل دیں جہاں گائے بندھی ہوئی تھی۔ آج وہ چپل نہیں پہنے تھیں۔ ان کے پیر سرخ مہاور سے رنگے ہوئے تھے اور چاندی کی چمکتی ہوئی پازیبیں ان میں بڑی اچھی لگ رہی تھیں۔
ہم نے دیکھا گائے کو اور جانوروں سے الگ لا کر کھڑا کر دیا گیا تھا۔ ایک نوکر اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر رہا تھا جیسے اسے شاباشی دے رہا ہو۔ وہ شاید چاچی کا ہی انتظار کر رہا تھا۔ گائے سب سے بے نیاز اپنے بچھڑے کو زبان سے چاٹ رہی تھی۔ وہ اتنا کمزور لگ رہا تھا کہ مشکل سے اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکتا تھا۔ صبح کے سورج کی روشنی میں وہ دونوں ایسے اچھے لگ رہے تھے اور بچھڑا ننھی سی جان تو ایسا پیارا لگ رہا تھا کہ جی چاہا اسے گود میں اٹھا لوں۔ چاچی کو دیکھ کر نوکر نے بچھڑے کو ذرا دور کر لیا۔ لیکن ایسا لگا یہ گائے کو اچھا نہیں لگا۔ بڑی بڑی کالی کالی آنکھوں سے اس نے مالی کی طرف دیکھا جیسے اس سے پوچھ رہی ہو، ''کیوں دور ہٹا دیا میرا بچہ مجھ سے؟''

---

(۱) نئی بیاہی گائے دودھ ابالا جاتا تھا جو ابلنے پر پھٹ جاتا تھا۔ پھر پانی الگ کر کے اسے کھوئے کی طرح کھایا جاتا تھا۔

چاچی آگے بڑھ کر ہاتھ جوڑ کر آہستہ آہستہ زیرِ لب کچھ پڑھتی رہیں۔ پھر سیندور سے انھوں نے گائے کے ماتھے اور سامنے کے کھروں پر ٹیکے لگا دیے۔ اور گیندے کے پھول اس کے سر پر چڑھا کر کیلے کا پتہ جس میں دہی اور لڈو رکھا تھا اس کے سامنے رکھ دیا اور ہاتھ جوڑ کر پیچھے ہٹ گئیں اور بچھڑے کی پیٹھ سہلانے لگیں۔

ہم سب کھڑے دیکھتے رہے لیکن ان کی پوجا کی وجہ ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ ہاں وہ ہمیں بڑی خوبصورت لگی۔ چند مہینوں بعد ہمیں امی نے بتایا کہ بنواری لال چاچا کے یہاں بیٹا ہوا ہے۔ ہم سب اس کی چھٹی پر تحفے لے کر گئے تو دیکھا کہ چاچی اسے گود میں لیے بیٹھی تھیں۔ میں وہیں ان کے پاس آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ ذرا سی دیر کے لیے چاچی نے اسے میری گود میں لٹا دیا۔ وہ اتنا منا اور پیارا تھا۔ میرا بس چلتا تو میں اپنے گھر لے آتی۔ آج بھی چاچی کی پوجا یاد آتی ہے تو سوچتی ہوں شاید پوجا کے روپ میں ایک ہونے والی ماں ایک نئی نویلی ماں کو مبارکباد دے رہی تھی۔ یہ بھی سوچتی ہوں کہ ہم کتنے خوش قسمت تھے کہ بلا امتیاز مذہب ہمیں وہ شفقتیں، دوستیاں اور محبتیں حاصل تھیں اور وہ اس وقت تعصبات کے بوجھ کے نیچے دفن نہیں ہوگئی تھیں۔

مولسری کے پھول

کار تیزی سے چلتی ہی چلی جا رہی تھی اور سڑک کے دو طرفہ درخت اس کا تعاقب کرتے ہوئے تھک تھک پیچھے چھوٹتے جا رہے تھے۔ وہ گھٹنوں کے بل کار کی پیچھے والی سیٹ پر بیٹھا کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھ رہا تھا کیونکہ کار کے اندر ہونے والے واقعات سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

اس کے قریب وہ عورت جسے لوگوں نے اسے بتایا تھا کہ وہ اس کی ماں ہے، بیٹھی ہوئی رو رہی تھی۔ اسے یاد آیا کہ سامنے کی سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص اس کا باپ ہے — کم از کم لوگوں نے تو اسے یہی بتایا تھا۔ لیکن ان دونوں سے اسے کوئی لگاؤ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اس کی چھوٹی سی دنیا کا محور تو اماں جی تھیں۔ سب ممانیوں، خالاؤں اور ان لوگوں کی بھی جو گھر کا کام کرتے تھے اور لوگ انہیں نوکر کہتے تھے، ان کی بھی وہ اماں جی تھیں۔ کام تو سب ہی کرتے تھے لیکن انہیں نوکر کیوں کہا جاتا تھا، یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی کیونکہ اس نے اپنی عمر کے تقریباً پانچ سال ہی طے کیے تھے اور جب سے ہوش آیا تھا، اماں جی کا مہربان چہرہ ہی دیکھا تھا — صابن کے جھاگ جیسے سفید بالوں کے درمیان جو ہمیشہ دوپٹے میں چھپے رہتے تھے۔ اسے یاد آیا کہ ان کے کانوں میں لٹکتی ہوئی بالیوں میں مولسری کے پھول گندھے رہتے۔ ان کی تیز خوشبو اس کے حواس پر چھا گئی۔ وہی میٹھی میٹھی خوشبو جس سے اماں جی کا وجود مہکتا رہتا تھا۔ وہی خوشبو سب سے پہلے اس وقت اس کی ناک میں بھر گئی تھی جب اماں جی نے اسے گود میں لے کر سینے سے لگایا تھا۔ وہ پہلی بار اس عورت اور مرد کے ساتھ ان کے پاس آیا تھا۔ وہی عورت اس کے قریب بیٹھی روئے جا رہی تھی۔ ایسے اوقات میں وہ ہمیشہ اپنے گردوپیش کو بھول کر اپنی دنیا میں بڑے اطمینان سے غائب ہو جاتا تھا جہاں چاروں طرف سکون ہی سکون تھا۔ اس دنیا میں اس کی وہ میٹھی میٹھی یادیں تھیں جب وہ اماں جی کے پاس پہلی دفعہ آیا تھا۔ اس وقت وہ صرف دو سال کا تھا اور لوگوں کا خیال ہے کہ دو سال کا بچہ کیا یاد رکھ سکتا ہے، لیکن وہ بھول جاتے ہیں کہ یادوں کا انحصار سمجھ پر نہیں ہوتا، وہ تو تاثرات کے دروازوں سے داخل ہو کر دل و دماغ کے کسی گوشے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنا گھر بنا لیتی ہیں اور کبھی کبھی دروازہ کھول کر ذہن پر اجاگر

ہو جاتی ہیں۔ کار تیزی سے آگے بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ مولسری کے پھولوں کی خوشبو سے بھرا ہوا کا جھونکا اسے مہکا گیا۔

اس کے ذہن میں وہ یاد تر و تازہ تھی جب پہلی بار اس نے اماں جی کو دیکھا تھا۔ وہ ''میری بیٹی، میری بیٹی'' کہہ کر اس کی ماں سے لپٹ گئی تھیں۔ یہ وہی ماں تھی جسے سب سے پہلے آنکھیں کھولنے کے بعد اس نے دیکھا تھا اور وہی شکل اس کے وجود کا محور بن گئی تھی۔ ایک دن وہی اسے اماں جی کے پاس لے آئی تھیں اور پھر کچھ بتائے بغیر رات کے اندھیرے میں غائب ہوگئی تھیں۔ اس نے کس بے چینی سے انہیں ڈھونڈھا تھا۔ گھر کے ہر ہر کونے میں جہاں وہ جا سکتا تھا۔ لیکن وہ دونوں کہیں نہیں ملے۔ اس نے بھی آہستہ آہستہ ان کی یاد کو اپنے دل سے نکال دیا۔ ان کی جگہ اب اماں جی کا شفیق اور نرم چہرہ بس گیا تھا۔ انہی کی شفقت کے سائے میں اس نے قریباً چار سال کا عرصہ گزار دیا۔ سب کہتے تھے وہ ان کا سایہ بن گیا تھا۔ وہی اسے اپنے ہاتھ سے نوالے بنا بنا کر کھلاتیں، وہی اسے نہلا کر اپنی گود میں چھپا لیتیں اور رات کو انہی کی بانہوں میں لیٹ کر سو جاتا۔ کیسا اچھا زمانہ تھا وہ! ہر طرف سکون اور نت نئی خوشیاں تھیں۔

ایک دن وہ دونوں پھر واپس آ گئے۔ اس بار وہ اچانک ہی نہیں آئے تھے، کئی ہفتوں سے ان کے آنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اس سے پہلے بھی اس کی امی کے خط اس کے لیے برابر آتے تھے لیکن ان میں اسے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ وہ یاد، وہ تلاش، وہ جدائی کا غم اب بیگانگی میں بدل گیا تھا۔ آخر ان کے آنے کا دن آ ہی گیا۔ سارا گھر پلاؤ کی خوشبو سے بھر گیا — پلاؤ جو اسے بہت پسند تھا۔ سب بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ اس کے ماموں اسٹیشن گئے ہوئے تھے اور پھر وہ دونوں ان کے ساتھ گھر میں داخل ہوئے۔ اس عورت نے جو اس کی ماں تھی، بڑھ کر اسے اپنی بانہوں میں لینا چاہا لیکن وہ اماں جی کے گلے میں مضبوطی سے لپٹ گیا اور اپنا چہرہ ان کے شانے میں چھپا لیا۔

سب اسے بار بار کہہ رہے تھے، ''ارے بیٹے، تیری ماں اتنی دور سے آئی ہیں۔ تیرے لیے اتنے اچھے اچھے تحفے لائی ہیں۔ جا ناں ان کے پاس۔'' لیکن اسے ان تحفوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کا دل بار بار کہہ رہا تھا، ''یہ میری ماں سہی لیکن اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ کیا معلوم ایک دن پھر مجھے چھوڑ کر غائب ہو جائیں۔'' اسے ان پر غصہ بھی تھا۔ بچپن میں جدائی کے کرب کی یاد اپنا سر اٹھا رہی تھی۔

آہستہ آہستہ اس کی ماں کے آنسوؤں اور محبت نے اسے منا ہی لیا۔ وہ ان سے مانوس ہی نہیں ہوگیا بلکہ وہ پہلے والی محبت بھی اس کے دل میں پنپنے لگی جو آنکھیں کھولتے ہی اس نے محسوس کی تھی۔ لیکن اب وہ محتاط بھی ہوگیا تھا۔ اس کی عمر تقریباً پانچ سال کی تھی اور اس زمانے میں اس نے بہت کچھ سیکھا تھا۔

ایک دن صبح اٹھ کر اسے بتایا گیا کہ اس کے والدین اسے دادا جی کے گھر لیے جا رہے ہیں۔ اس نے بھی دادا جی کو دیکھا تھا۔ وہ اس کے والدین کی غیر موجودگی میں کبھی کبھی خاص طور پر اس سے ملنے آتے تھے۔ ان کی سفید سفید داڑھی اسے بڑی اچھی لگتی تھی۔ لیکن ان کے پاس سے اماں جی کی طرح پھولوں کی خوشبو نہیں آتی تھی۔ اس کے بجائے حقّے کی ایک عجیب سی بو ان کی سانس میں بسی ہوئی تھی جو اسے بالکل اچھی نہیں لگتی تھی۔ انھوں نے ہی اسے بتایا تھا کہ اس کی دادی کا انتقال ہو چکا ہے، اسی لیے اسے اماں جی کے پاس رکھا گیا ہے حالانکہ ان کا دل یہی چاہتا ہے کہ وہ ان کے ہی پاس رہتا۔ وہ سال میں ایک آدھ بار آکر اسے ضرور دیکھ جاتے تھے لیکن کبھی اتنی دیر نہیں رکے کہ ان سے زیادہ قربت ہو جاتی۔ اسے ان کے پاس جانے میں کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن جب معلوم ہوا کہ اماں جی اس کے ساتھ نہیں جا رہی ہیں تو اس کو بھی جانے کی خواہش نہیں رہی۔ مگر اسے جانا ہی پڑا۔ اس کی ماں نے خوشامد کی، باپ نے ناراضگی کا اظہار کیا اور آخر میں اماں جی نے سمجھا بجھا کر جانے پر راضی کرلیا۔ انھوں نے کہا تھا، ''میرے لال! بس دو دن کے لیے چلے جاؤ، پھر تو میرے ہی پاس آؤ گے۔'' اور اپنے کپڑے، چند کھلونے لے کر وہ دادا جی کے گھر چلا گیا۔ اس نئے ماحول میں اس کا دل بہل گیا حالانکہ روز رات کو اماں جی کی یاد اس کے ذہن کا دروازہ کھٹکھٹاتی تھی اور وہ سوچتا، ''بس دو دن بعد چلے جائیں گے۔'' پھر وہ سکون سے سو جاتا۔ اس نے اپنی ماں سے بھی پوچھا، ''اماں جی کے پاس ہم کب واپس جائیں گے؟'' اور اسے یہی جواب ملا، ''بہت جلدی۔''

دن تیزی سے گزر گئے۔ ایک دن دوبارہ ان کا سامان سوٹ کیسوں میں پیک کیا جانے لگا۔ اس کے کھلونے اور کپڑے وغیرہ بھی پیک کیے جا رہے تھے۔

''ہم اماں جی کے پاس جا رہے ہیں نا؟'' اس نے اپنی ماں سے پوچھا لیکن انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سر نیچا کیے اس کے کپڑے سوٹ کیس میں رکھتی رہیں۔ انھوں نے آنکھ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ جب قریب آکر اس نے سر جھکا کر ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

دیکھنا چاہا تو اسے محسوس ہوا کہ وہ آنسوؤں سے بھری تھیں۔

''آپ رو کیوں رہی ہیں؟ ہم اماں جی کے پاس ہی تو جارہے ہیں۔'' اس نے تشویش سے پوچھا۔

''فضول کی باتیں نہ کرو،'' اس کے باپ نے اس سے درشت لہجے میں کہا۔ ''جاؤ باہر جاکر کھیلو۔'' اور وہ ان کے غصے کی وجہ سمجھے بغیر باہر نکل گیا۔ اماں جی ہوتیں تو وہ ان سے ضرور پوچھتا لیکن وہ تو وہاں نہیں تھیں۔ وہ باغ میں نکل گیا اور بڑی دیر تک ان چڑیوں کو دیکھتا رہا جو گھونسلے میں اپنے ننھے ننھے بچوں کو دانہ کھلا رہی تھیں۔ پھر باغ کے حوض پر جاکر کنکریاں پھینک پھینک کر لہریں بناتا رہا، جب تک دادا جی کی آواز نہیں سنی۔ وہ اسے بلانے آئے تھے۔ ان کی انگلی پکڑ کر وہ گھر کی طرف چل دیا جہاں سب ہی اداس تھے۔ کار میں بٹھانے سے پہلے سب ہی نے اسے گلے لگا کر پیار کیا تھا۔ دادا جی کی سفید داڑھی آنسوؤں سے بھیگ گئی تھی۔ اسے ان پر بہت رحم آیا تھا۔ ان سے لپٹ کر اس نے اپنی بانہیں ان کے گلے میں ڈال دی تھیں اور جیسے اماں جی اس کے گالوں پر پیار کرکے اسے چپ کراتی تھیں، اس نے بھی دادا جی کو چپ کراکے کہا تھا، ''روئیے نہ دادا جی۔'' اس وقت ان کی سانس میں بسی ہوئی تمباکو کی بو بھی اسے بری نہیں لگی تھی۔ پھر سب کو روتا چھوڑ کر وہ کار میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ لیکن کافی وقت گزر جانے کے باوجود بھی وہ اماں جی کے گھر سے بہت دور تھے۔ آخر کار گھبرا کر اس نے ماں سے پوچھا، ''ہم اماں جی کے پاس ہی تو جارہے ہیں ناں؟'' لیکن انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سب ایک دم خاموش ہو گئے۔

کار اس کے چچا چلا رہے تھے۔ اس کے باپ ان کے قریب ہی بیٹھے تھے۔ اس نے دیکھا ان کی گردن ایک دم سرخ ہوگئی۔ اس کی ماں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی قطار دوبارہ بہنے لگی۔ وہ بھی اس خاموشی سے پریشان ہوگیا۔ لیکن اس میں ان کی خاموشی توڑنے کی ہمت نہیں تھی۔

کچھ دیر بعد اسے اپنے باپ کی آواز سنائی دی، ''ہم لندن جارہے ہیں، اماں کے پاس نہیں۔'' وہ اس کی طرف دیکھے بغیر کہہ رہے تھے۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

''کیوں؟'' اس نے وضاحت کے لیے پوچھا۔

انھوں نے مڑے بغیر جواب دیا، ''کیونکہ تم اب بڑے ہوگئے ہو۔ اب ہمارے پاس ہی لندن میں رہوگے۔ وہیں اسکول جاؤ گے۔ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ ہم اماں جی کے پاس

دوبارہ جائیں...اور کوئی ضرورت بھی نہیں ہے۔تمہاری امی نے ان کو خط لکھ کر سب بتا دیا ہے۔''
اسے محسوس ہوا جیسے اس کی ماں کے لیے آنسو ضبط کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ منہ سے ایک سسکی سی نکلنے سے پہلے انھوں نے اسے رومال میں دبالیا۔

''اب رونا دھونا بند کرو۔ کہہ دیا ناں اگلے سال پھر واپس آئیں گے،'' اس کے باپ نے ترشی سے کہا، لیکن وہ خاموش بیٹھا رہا۔ گر کر چوٹ لگنے پر وہ بار ہا رویا تھا لیکن اسے لگا یہ چوٹ اتنی گہری تھی کہ اس نے آنسو بھی خشک کر دیے تھے۔

کار آگے بڑھتی رہی۔ وہ گم سم گھٹنوں کے بل بیٹھا کار کی پیچھے والی کھڑکی سے سڑک کے دوطرفہ درختوں کو دوڑتے دیکھتا رہا۔ اس نے اپنے باپ سے کوئی سوال نہیں کیا کیونکہ اسے احساس تھا کہ کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملے گا۔ اسے یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں وہ اور ناراض نہ ہو جائیں۔

اس کی روتی ہوئی ماں نے اسے گود میں لے کر پیار کرنے کی کوشش کی لیکن ان کا بڑھا ہوا ہاتھ ہٹا کر وہ ویسے ہی بیٹھا رہا اور نجانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ وہ اپنی ماں کی گود میں سو گیا تھا۔

جب وہ جاگا تو کار ایرپورٹ کے بہت قریب آگئی تھی جہاں چھوٹے بڑے جہاز کھڑے ہوئے تھے۔ اس کی ماں نے ان کی طرف اشارہ کر کے مسکراتے ہوئے کہا، ''ان میں سے ہی ایک جہاز میں بیٹھ کر ہم تم لندن جائیں گے۔تم جب آئے تھے تو بہت چھوٹے تھے اس لیے کچھ یاد نہیں ہو گا لیکن اب بڑے ہو گئے ہو۔ بہت مزہ آئے گا۔''

سوتے میں وہ کچھ دیر کے لیے بھول گیا تھا کہ اماں جی کو چھوڑ کر وہ ایک انجانے ملک میں چلا جائے گا لیکن ماں کی باتوں نے اسے سب یاد دلا دیا۔ اور وہ ان سے ہٹ کر خاموش بیٹھا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیسے انہیں سمجھائے کہ لندن سے اسے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ اس چھوٹے سے شہر میں اماں جی اور اپنے ہم عمر دوستوں کے ساتھ بہت خوش تھا۔ اس نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔

کار سے اتر کر وہ سب ایرپورٹ چلے گئے۔ شام ہو چکی تھی اور ان کے روانہ ہونے کا وقت آ گیا تھا۔ اس کے والد نے اپنے بھائی کو گلے لگا کر خدا حافظ کہا۔ اس کی ماں نے بھی آنسو بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے انہیں دعائیں دیں۔ چچا نے اسے گود میں لے کر پیار کیا لیکن وہ خاموش ہی رہا۔ وہ ان کو جانتا ہی کب تھا جو انہیں چھوڑنے کا غم ہوتا!

اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ کر جہاز پر چڑھتے ہوئے اس نے انہیں غور سے دیکھا اور سوچا، ''یہ میری

ماں سہی لیکن میں کبھی بھی ان پر اعتبار نہیں کر سکتا۔‘‘

جہاز میں وہ ان کے پاس ہی بیٹھا رہا۔ دوسری طرف اس کے باپ بیٹھے تھے۔ اتنے قریب ہوتے ہوئے بھی وہ ان سے بہت دور تھا۔ ایک کتاب میں رنگین تصویریں دیکھتا رہا لیکن اس میں کیا لکھا ہے، یہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ مولوی صاحب سے قرآن شریف اور اردو تو پڑھی تھی مگر انگریزی کی پہلی ہی کتاب ماموں کے ساتھ ختم کی تھی۔ سامنے رکھی ہوئی کتاب کے حروف ایک دوسرے میں خلط ملط ہوتے رہے اور وہ خاموش بیٹھا رہا۔

اسے محسوس ہوا اس کی ماں بار بار اسے فکر سے دیکھ رہی تھیں۔ پھر وہ دونوں انگریزی میں باتیں کرتے رہے جنہیں وہ سمجھ نہیں سکا۔ اسے کوئی دلچسپی بھی نہیں تھی۔

سارا سفر سوتے جاگتے گزر گیا۔ راستے میں اسے جو کچھ بھی کھانے کو دیا گیا، کوئی ذائقہ محسوس کیے بغیر اس نے کھالیا۔ وہ ایک خواب جیسی حالت میں تھا۔ جب اس کی ماں نے بتایا کہ وہ لندن پہنچ گئے ہیں تب بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ جہاز سے اترتے ہوئے اس کے معصوم دل نے کہا، ’’اب میں اماں جی کو کبھی نہیں دیکھوں گا۔‘‘

گھر پہنچ کر ایک عجیب سی، انجانی سی، تھکا دینے والی کیفیت اس پر کافی عرصے تک طاری رہی۔ اسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے لندن کے گدلے گدلے آسمان کا عکس ہر چیز پر چھایا ہوا تھا۔ پھول، پتے، آسمان، ہر چیز سے جیسے کسی نے رنگ نچوڑ لیا تھا اور وہ خوشبوئیں جن کا ایک خزانہ وہ اپنے ساتھ لایا تھا، وہ بھی اس کے ذہن میں مقفل ہوگئی تھیں۔ یہاں کوئی پھول نہیں مہکتا تھا، کوئی تیز یا بھینی بھینی، دل کو رجھا دینے والی ایسی خوشبو نہیں تھی جو اس کی دوست بن جاتی۔ اماں جی کے باغ میں ہر وقت گاتی ہوئی چڑیاں اور سب سے زیادہ کوکو کرتی ہوئی کوئل جس کے ساتھ مل کر وہ بھی اس کا گیت گاتا تھا، کہیں بھی نہیں تھیں۔

کبھی کبھار جب سورج نکلتا تھا وہ بھی بجھا بجھا سا رہتا تھا اور اپنا بے مقصد سفر ختم کر کے ڈوب جاتا تھا۔ بارش جو اسے محسوس ہوتا تھا کبھی تھمتی ہی نہیں تھی اور نہ ایسی کھل کر ہوتی تھی جیسے اماں جی کے یہاں ہوتی تھی جہاں باغ کے پیاسے درخت اس سے سرشار ہو جاتے تھے اور سوکھی سوکھی مٹی پانی میں بھیگ کر مہک اٹھتی تھی جس کی سوندھی سوندھی خوشبو اس کے وجود پر چھا جاتی تھی۔ وہ اماں جی کے گھر سے نجانے کتنی یادیں لے کر آیا تھا، تیز اور بھینی بھینی خوشبوئیں بھی ان میں بسی ہوئی تھیں۔ اس نے

سوچا، ''یہ گھر ابو امی کا ہے، وہ گھر اماں جی کا تھا... لیکن میرا گھر کہاں ہے؟''

اسے مایوس کن جواب ملا، ''میرا کوئی گھر نہیں۔ ابو امی جہاں چاہتے ہیں، چھوڑ دیتے ہیں اور پوچھے بغیر وہاں سے لے بھی آتے ہیں۔ کیسے ہیں یہ لوگ؟''

ایک طویل، بہت طویل عرصہ اسی طرح گزر گیا۔ آہستہ آہستہ وہ اپنی ماں کے قریب آنے لگا کیونکہ وہ گھر پر ہی رہتی تھیں جبکہ ابو صبح صبح کام پر چلے جاتے اور شام کو تھک کر واپس آتے۔ کھانا ختم کرنے کے بعد ان کے پاس اس کے لیے زیادہ وقت نہیں ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ انہیں اس کی تعلیم کی بھی بڑی فکر تھی کیونکہ اسے انگریزی بولنا نہیں آتی تھی۔ اسی لیے وہ اس سے انگریزی میں ہی گفتگو کرتے تھے جو اس کی سمجھ میں زیادہ نہیں آتی تھی۔ اس کی ماں کو بھی ان کی یہی ہدایت تھی کہ وہ اس سے انگریزی میں ہی بات چیت کریں تاکہ اسکول میں اس کو زیادہ مشکل نہ ہو۔ وہ جب تک گھر پر ہوتے، سب انگریزی بولتے۔ شاید اسی لیے ان دونوں کے درمیان ایک دیوار سی قائم ہوگئی تھی جسے پار کرکے وہ ایک دوسرے کے زیادہ قریب نہیں آسکے۔

کھانا کھلانے کے بعد اسے جلدی ہی سلا دیا جاتا تھا۔ وہاں وہ اپنی خوابوں کی دنیا میں بالکل آزاد تھا۔ جہاں چاہتا، گھومتا پھرتا۔ صرف مشکل یہ تھی کہ صبح ہوتے ہی وہ خواب غائب ہو جاتے تھے۔

آہستہ آہستہ دن گزر گئے۔ اس کا اسکول کھل گیا۔ کتنے بچے تھے وہاں لیکن وہ ان کی باتیں اچھی طرح اب بھی نہیں سمجھ پاتا تھا حالانکہ ساری گرمیوں میں امی نے اسے انگریزی سکھائی تھی۔ اس نے انگریزی پڑھنا سیکھ لیا تھا لیکن بچوں کی باتیں اس کی سمجھ میں پوری طرح آتی نہیں تھیں۔ خاص کر کھیل کے میدان میں جہاں وہ چیخ کر باتیں کرتے، ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے اور اسے بھی دھکے دیتے ہوئے تیزی سے گزر جاتے۔ وہ ڈرا ڈرا ان عورتوں کے ساتھ لگا رہتا جو بچوں کی نگہداشت کے لیے کھیل کے میدان میں موجود رہتی تھیں۔

آہستہ آہستہ وہ زمانہ بھی گزر گیا۔ اب وہ کسی حد تک بچوں سے مل جل گیا تھا۔ اگرچہ اب تک انگریزی اور بچوں کی طرح بول نہیں سکتا تھا لیکن لکھنے پڑھنے اور حساب میں ان سے آگے ہی تھا۔ شرارت کرنی تو جیسے اس نے سیکھی ہی نہیں تھی۔ شاید اس لیے کہ ایک انجانا سا ڈر اس کے دل کے کسی گوشے میں ہمیشہ موجود رہتا تھا جس نے کبھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑا اور شرارتیں کرنے کی ہمت اسے نہیں ہونے دی۔ اس کی کلاس ٹیچر اس کی ذہانت، محنت اور نیک رویے سے متاثر ہوکر اس کی شفیق

دوست سی بن گئی تھی۔

اماں جی شروع شروع کے دنوں میں بہت یاد آتیں اور اس نے اپنی ماں سے پوچھا، ''ہم اماں جی کے پاس جلدی ہی جائیں گے نا؟'' انھوں نے یہی جواب دیا، ''بیٹے ابھی تو آئے ہیں۔ اماں جی تو بہت دور رہتی ہیں۔ آپ اماں جی کو برابر خط لکھتے رہیے۔'' وہ انہیں کیسے بتاتا کہ خطوں کے ذریعے اتنا طویل راستہ کیسے پار کیا جاسکتا ہے کہ وہ اماں جی کی مہکتی ہوئی گود میں سر رکھ کر سو جائے۔ یہ سب باتیں بتانا بہت مشکل تھا۔ اس کے علاوہ اپنے جذبات کا اظہار کرنا اسے آتا بھی نہیں تھا۔

وہ دن بھی گزر گئے۔ سردیاں آگئیں۔ اس نے پہلی بار اونی کپڑے اور گرم کوٹ پہنا جس سے اسے بڑی کوفت ہوئی۔ لیکن اسی زمانے میں اسکول کی زندگی پہلے سے بہت خوشگوار ہوگئی کیونکہ سارا اسکول موسیقی، رنگ اور روشنیوں سے بھر گیا۔ اسے بتایا گیا کہ یہ Baby Jesus کی سالگرہ کی تیاری ہے۔ یہ بات اس کی سمجھ میں زیادہ نہیں آئی۔ ان دنوں اسکول کی زندگی اس قدر مصروف تھی کہ زیادہ غور کرنے کا اسے وقت نہیں ملا۔ چھٹی سے ایک دن پہلے ڈرامے، کانسرٹ اور کرسمس پارٹی کے بعد اس کی کلاس کا ہر بچہ فادر کرسمس کے لائے ہوئے تحفوں کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ انھوں نے طرح طرح کے کھلونوں کی فرمائش فادر کرسمس سے کی تھی۔

گھر جا کر اس نے بھی اپنی ماں سے پوچھا، ''امی فادر کرسمس میرے لیے بھی تو تحفے لائیں گے؟''

وہ کچھ دیر خاموش رہیں، پھر بولیں، ''بیٹے فادر کرسمس کرسچین بچوں کے لیے تحفے لاتے ہیں۔''

''کیوں؟'' اس نے مایوسی سے پوچھا۔

''کیونکہ ہم بے بی جیسس کو نہیں مانتے۔ ہم مسلمان ہیں اور اپنے پیغمبر کو مانتے ہیں۔ ہمارا تہوار عید ہے۔''

اس نے بحث کرنا نہیں سیکھا تھا لیکن مایوسی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے سوچا، ''ہم ان سے الگ ہیں تو یہاں کیوں آئے؟ فادر کرسمس ہر بچے کے لیے تحفے لائیں گے، صرف میرے لیے نہیں کیونکہ میں غیر ہوں نا۔''

کرسمس آیا اور چلا گیا۔ کرسمس کے دن ان کے یہاں اور باہر بھی کچھ زیادہ ہی خاموشی رہی۔

لیکن انہی چھٹیوں میں اس نے پہلی بار آسمان سے اترتی ہوئی نرم نرم صاف شفاف صابن کے جھاگ جیسی برف دیکھی۔ اپنے باغ میں سفید سفید برف کے گالوں کا تعاقب کرتا رہا جو اس کے گالوں کو چھوکرنجانے کہاں غائب ہوجاتے تھے۔ کھڑکی میں کھڑی ہوئی اس کی ماں اسے دیکھ کر ہنستی رہیں۔ پھر خود بھی باہر آکے انھوں نے زمین سے برف اٹھا کر اور اس کے گولے بنا بنا کر اس کی طرف پھینکنا شروع کیے، جیسے وہ اس کے ساتھ گیند کھیل رہی ہوں۔ دونوں یہ کھیل اس وقت تک کھیلتے رہے جب تک انہیں سردی نہیں لگی۔ پھر اندر جا کر وہ دونوں آتش دان کے سامنے بیٹھے گرم گرم دودھ میں ملا چاکلیٹ پیتے رہے۔ اس دن کی خوشگوار یاد اب بھی اس کے ذہن میں تازہ تھی کیونکہ پہلی بار وہ اپنی ماں کے اتنے قریب آیا تھا۔

رات کو وہ اپنے نرم اور گرم بستر میں سوگیا اور اس نے خواب میں دیکھا کہ اماں جی اس کے ساتھ برف کی گیندوں سے کھیل رہی ہیں۔ ان کے سر پر سفید برف کے گالوں سے بنا ہوا ایسا ہی تاج ہے جو اسکول کے ڈرامے میں Baby Jesus کی ماں میری نے پہنا تھا۔ وہ دونوں کھیلتے رہے۔ بھاگتا ہوا وہ بہت دور نکل گیا لیکن اماں جی پیچھے ہی رہ گئیں اور پھر نجانے کہاں غائب ہو گئیں۔ مڑ کر وہ انہیں تلاش کرتا رہا لیکن وہ کہیں نہیں ملیں۔ گھبرا کر اس نے آنکھیں کھولیں تو صبح ہو چکی تھی۔ وہ خواب بار بار اسے یاد آیا، پھر وہ بھی ان یادوں کے گروہ میں شامل ہوکر وہیں قیام پذیر ہو گیا جہاں اس کی دوسری یادیں بستی تھیں۔ اماں جی کی یاد بھی وہیں سوگئی کیونکہ اسے جگائے رکھنا دن بدن مشکل ہوتا جارہا تھا۔

چھ سال کے بعد، جو اس کے لیے بہت طویل عرصہ تھا، جب وہ اماں جی کے گھر گیا تو اسے احساس ہوا کہ ایک زمانہ گزر گیا ہے۔

کبھی کبھی اس نے سوچا بھی تھا کہ ہم تو جلدی ہی واپس جانے والے تھے، پھر کیا ہوا؟ لیکن اب وہ گیارہ برس کا ہوچکا تھا۔ اسے احساس تھا کہ وہ جانا تو چاہتے تھے لیکن حالات کی بنا پر مجبور ہو گئے تھے۔ کبھی ابو کی بے انتہا مصروفیت، کبھی امی کا ٹیچر بننے کے لیے امتحان اور اس کی تیاری، خود اس کی پڑھائی— کچھ نہ کچھ وجہ ہوتی جس کی بنا پر وہ جاتے جاتے رہ جاتے۔ اس سال بھی نہ جاتے اگر اماں جی کی بیماری کا خط نہ آتا جسے پڑھ کر اس کی امی اتنی اداس ہوگئیں۔ بڑی جلدی سفر کا انتظام کر کے وہ روانہ ہوگئے۔ سارے راستے وہ عجیب سی کیفیت سے گزرتا رہا تھا جس میں خوشی، ایک انجانا

خوف، امیدیں اور نجانے کون کون سے جذبے شامل تھے۔ ذہن کے گوشوں میں سوتی ہوئی یادیں انگڑائیاں لینے لگیں۔ اس نے جھجکتے ہوے کار سے اتر کر اسی پرانے مانوس گھر میں قدم رکھا جس کا ہر ہر کونا اس سے بولتا تھا مگر آج اس کی خاموشی اور اداسی سے وہ ڈر گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اماں جی بیمار ہیں لیکن اس نے یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ اتنی کمزور ہوجائیں گی اور اتنی بدل جائیں گی کہ وہ انہیں مشکل سے پہچان سکے گا۔

ان کے صابن کے جھاگ جیسے سفید سفید بال اپنی چاندی جیسی چمک کھو چکے تھے۔ آگے کے چار دانت ٹوٹ گئے تھے۔ وہ خاموش ان کے پلنگ کے قریب کھڑا انہیں دیکھتا رہا اور سوچتا رہا، ''میری اماں جی کہاں گئیں؟ یہ بوڑھی عورت اماں جی ہوتے ہوے بھی وہ اماں جی نہیں ہیں۔'' اور جب انھوں نے اسے گلے لگا کر پیار کیا تو اسے محسوس ہوا کہ مولسری کے پھولوں کی وہ خوشبو جس سے ان کا وجود معطر رہتا تھا، اڑ کر کہیں چلی گئی ہے۔ اس کے بجائے ان کے کپڑوں سے دوائیوں کی بو آ رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ ایک اور عجیب بو جسے کوئی نام نہیں دیا جاسکتا تھا— ایک اداس کر دینے والی بو جو اس سے پہلے کسی کے بھی پاس سے نہیں آئی تھی۔ جس طرح مولسری کے پھولوں کی خوشبو نے اسے اماں جی کی گود میں آنے کا بلاوا دیا تھا، یہ عجیب سی بو اسے ان سے دور کر رہی تھی۔

''میرا بیٹا بڑا ہوگیا،'' انھوں نے اسے پیار سے دیکھ کر کہا، ''اور اب سنجیدہ بھی ہوگیا ہے۔ آؤ میرے پاس بیٹھو۔'' لیکن وہ خاموش کھڑا کھڑا انہیں دیکھتا رہا۔ اس کی ماں نے کہا ''جاؤ اپنے بھائی بہنوں سے کھیلو۔'' وہ اماں جی کے کمرے سے اپنے ماموں زاد بھائیوں کے ساتھ باہر نکل گیا۔ ان سے کھیل کر اسے کچھ زیادہ لطف نہیں آیا۔ وہ اس کے اپنے عزیز سہی لیکن وہ ان کو اچھی طرح نہیں جانتا تھا۔ چھ سال کے عرصے کے بعد ان کی طرح اپنی زبان بھی نہیں بول سکتا تھا۔ وہ سب مل کر تیزی سے باتیں کر رہے تھے۔ اس کے لہجے، اس کی زبان کی غلطیوں کا مذاق اڑا رہے تھے۔ وہ سب مل کر ایک تھے اور وہ اکیلا تھا۔ اسے محسوس ہوا لندن کے بچوں کی طرح یہ بھی اس سے دور تھے۔ مگر آہستہ آہستہ وہ ان کے قریب آ گیا— لیکن چھ ہفتے بڑی تیزی سے گزر گئے۔ وہ دوبارہ سوٹ کیسوں میں اپنا سامان پیک کر کے لندن واپس چلے گئے۔

کچھ دنوں بعد ایک تار آیا کہ اماں جی اب اس دنیا میں نہیں رہیں۔ اس نے سوچا وہ تو اسی دن اس کی زندگی سے بہت دور چلی گئی تھیں جب ان کے پاس واپس آنے کا یقین دل میں لیے

ہوے وہ دادا جی کے گھر چلا گیا تھا۔ وہ اماں جی تو اب اس کے خوابوں میں ہی آتی تھیں۔

وہ ہمیشہ سے ہی کم گو تھا لیکن اب اس کی خاموشی اور بھی بڑھ گئی تھی۔ اب وہ سولہ برس کا تھا۔ کبھی کبھی اسے محسوس ہوتا کہ آس پاس کی روشنی مدھم پڑ گئی ہے اور ہر چیز اپنا رنگ کھو کر سرمئی سی ہو گئی ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ یہ دیکھ کر اسے تعجب بھی ہوتا کہ اس کے علاوہ کسی اور کو روشنی کی کمی کی شکایت نہیں تھی۔ کچھ دن بعد آہستہ آہستہ روشنی واپس آ جاتی۔ اس کی اداسی بھی کم ہو جاتی۔ زندگی اپنے رویے پر چلتی رہی۔ اس میں بھی کوئی ایسی تبدیلی نہیں ہوئی جس سے کسی کو کوئی مشکل پیدا ہوتی۔

اس دن ہیڈ ماسٹر نے اس کو آفس میں بلا کر بتایا کہ اس کے والد دل کا دورہ پڑنے کی وجہ سے ہسپتال میں ہیں۔ اس کی ماں ان کے پاس ہیں۔ اسے بھی انھوں نے وہیں بلایا ہے۔ نجانے کیا وجہ تھی کہ وہ کبھی بھی اپنے والد کے زیادہ قریب نہیں آ سکا تھا۔ لیکن یہ خبر سنتے ہی بے حد گھبرایا ہوا ہسپتال پہنچ گیا۔ مگر اس کا انتظار کیے بغیر انھوں نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ ان کے پلنگ کے چاروں طرف پردہ لگا دیا گیا تھا۔ پاس ہی اس کی ماں خاموش پتھر کی طرح بیٹھی ہوئی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی وہ تڑپ کر اٹھیں اور اس کے سینے پر سر رکھ کر سسک سسک کر رونے لگیں۔ لیکن اسے ان سے کسی ہمدردی کا احساس نہیں ہوا۔ وہ خاموش کھڑا کھڑا اپنے والد کا چہرہ دیکھتا رہا۔ اس نے سوچا اب ہم دونوں کبھی ایک دوسرے کے قریب نہیں آئیں گے۔ کتنی باتیں ان سے کہنا تھیں، وہ کبھی نہیں کہی جائیں گی۔ اس کی آنکھیں بالکل خشک تھیں۔ نجانے کس پر اسے بری طرح غصہ آ رہا تھا۔ پھر اس کے ذہن کے دروازے پر کسی نے دستک دے کر کہا، ''یہ سب اس عورت کی وجہ سے ہوا ہے۔ اس نے تمھیں اماں جی سے جدا کیا، ابو کے قریب بھی نہیں آنے دیا اور اب ایسے رو رہی ہے جیسے اس کا کوئی قصور نہیں۔''

ماں کے سر کو اپنے سینے سے ہٹا کر بڑبڑاتا ہوا وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس کی ماں کھڑی رہ گئیں۔ انہیں احساس ہوا کہ ان کا شوہر ہی نہیں، ان کو سہارا دینے والا اکلوتا بیٹا بھی انہیں چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ کسی طرح گھر آ کر انھوں نے دوستوں اور ایک رشتہ دار کو خبر دی۔ جلد ہی وہ جمع ہو گئے لیکن ان کے بیٹے کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ کافی دیر بعد وہ واپس آیا تو کسی سے کچھ کہے بغیر سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ لوگوں نے اس کی ماں کو دلاسا دیا، ''غم کی وجہ سے

ایسی حالت ہوگئی ہے۔ صبر آتے آتے وقت لگے گا۔'' اس کے بعد وہ اپنے کمرے سے بہت کم باہر نکلا کیونکہ اب پھر اس پر وہی پرانی کیفیت چھاگئی تھی۔ اس کے گردونواح کی ہر چیز کا رنگ غائب ہوگیا تھا۔ ہر طرف دھندلکا سا چھایا ہوا تھا مگر اس کا ذکر اس نے کسی سے کیا نہیں کیونکہ باتیں کرنے کی خواہش اسے بالکل نہیں تھی، اپنی ماں سے بھی نہیں۔

اسی طرح دو دن گزر گئے۔ وہ اس کے باپ کا جنازہ دفنا کر گھر واپس آئے تھے۔ اس کی ماں رو رو کر نڈھال ہوگئی تھیں۔ سب کے کہنے پر کچھ دیر آرام کرنے کے لیے وہ اپنے سونے کے کمرے میں جا کر لیٹ گئی تھیں۔ تھکن کی وجہ سے ان کے اعضا شل ہوگئے تھے۔ لیٹے لیٹے ان کی آنکھ لگ گئی تھی۔ لوگوں کی دیکھ بھال عزیز اور اقربا کر رہے تھے۔ وہ کچھ دیر ان کے پاس خاموش بیٹھا رہا، پھر اٹھ کر اپنی ماں کے کمرے میں چلا گیا۔ اس نے دیکھا وہ گہری نیند سو رہی ہیں۔ کھڑا کھڑا چند لمحے وہ انہیں دیکھتا رہا، پھر ایک جانی پہچانی معتبر آواز نے اس سے کہا، ''دیکھو کیسے چین سے یہ عورت سو رہی ہے حالانکہ سارا قصور اس کا ہے۔ یہ گھر تو تباہ کیا ہی ہے، نجانے کتنے گھر اور تباہ کرے گی۔'' غیر ارادی طور پر پلنگ کے پاس رکھا ہوا گل دان اس کے ہاتھ میں آگیا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کر سکے، اس نے گل دان ان کے سر پر زور سے مارا۔ وہ چیخ کر اٹھ بیٹھیں۔ خون ان کے سر سے بری طرح بہہ رہا تھا اور ٹوٹے ہوئے گل دان کے ٹکڑے چاروں طرف بکھرے پڑے تھے۔ ان کی چیخ سن کر دوسرے کمرے سے آکر لوگ جمع ہوگئے۔ اس کے بعد اسے کچھ یاد نہیں رہا۔ کس طرح پولیس والوں نے اسے ڈھونڈھا، وہ کس طرح ڈاکٹر کے کہنے سے ہسپتال میں داخل کر دیا گیا اور اب وہیں تھا۔

ڈاکٹروں نے اس کی ماں کو بتایا تھا کہ ان کا خیال ہے اسے کافی دن سے ڈپریشن کے دورے پڑتے تھے اور اب وہ Schizophrenia کا شکار ہوگیا ہے۔

''لیکن کیوں؟'' اس کی ماں نے پوچھا۔

''وجہ تو نہیں معلوم لیکن ہم یہ ضرور جانتے ہیں کہ دماغ کا کیمیکل بیلنس بگڑ جاتا ہے۔ مگر دوائیں دے کر آہستہ آہستہ پھر نارمل حالت پر لایا جاسکتا ہے۔''

اس کی ماں نے پوچھا، ''اس قسم کی حالت پھر تو نہیں ہوگی؟''

''یہ بھی نہیں کہا جاسکتا لیکن دوائیں برابر جاری رہیں گی اور جب دورہ پڑے، فوراً ہسپتال میں داخل کیا جائے گا تاکہ وہاں حفاظت سے رکھا جائے اور علاج کیا جائے۔''

اب اس کی ماں ہسپتال میں ہی اس کے پلنگ کے پاس کھڑی تھیں۔ ان کے سر پر بیوگی کی نشانی سفید دوپٹہ تھا۔ اسے Sedate کردیا گیا تھا۔

''بیٹے!'' ماں نے نرمی سے آواز دی۔ اس نے آنکھ کھول کر ان کی طرف دیکھا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا لیکن سچ مچ اماں جی ہی کھڑی اسے آواز دے رہی تھیں — وہی صابن کے جھاگ جیسے سفید بال، وہی مولسری کے پھولوں کی خوشبو ان کے پاس سے آرہی تھی۔ اس نے اپنی ماں کی طرف محبت سے دیکھ کر کہا، ''اماں جی آپ آگئیں!'' اور پھر آنکھ بند کر کے اسی پرانی دنیا میں لوٹ گیا جہاں اماں جی تھیں، پھولوں کی خوشبو تھی اور چڑیاں چہکتی تھیں۔ کار اسے تیزی سے وہیں واپس لیے جارہی تھی۔

نعمت خاں

کوئی نہیں جانتا تھا وہ کس خاندان سے تعلق رکھتے تھے، کس گاؤں یا قصبے کو چھوڑ کر ایک دن اس چھوٹے سے شہر سے ذرا باہر چوراہے پر ایک دن اچانک آئے تھے۔ اتنا ضرور تھا کہ انہیں دیکھ کر لوگوں کو خیال ہوا کہ وہ کسی شریف خاندان کے فرد تھے۔ لیکن بار بار پوچھنے کے باوجود انھوں نے اپنے متعلق کسی کو کچھ بھی بتایا نہیں۔

جب وہ آئے تھے تو ان کے پرانے فیشن کے پٹھے دار بالوں میں کہیں کہیں سفیدی آ چلی تھی۔ ان کا جسم ورزشی اور قد دراز تھا۔ جب تک کھڑے ہوجاتے تو شاید ہی کوئی ان کے شانے سے اونچا نکل پاتا۔ ان کی گھنی داڑھی، چہرے کے نقش ونگار اور کھلتا ہوا رنگ دیکھ کر ان قبیلوں کی یاد آجاتی جو درۂ خیبر سے گزر کر ہندوستان آئے تھے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ وہ کوئی جرم کر کے بھاگے تھے مگر اس کا ثبوت کسی کو بھی نہیں مل سکا تھا۔

ان کی بول چال اور لہجے میں ایک غرور سا تھا لیکن کبھی بھی کسی نے انہیں کسی سے بحث کرتے نہیں دیکھا تھا۔ شین قاف درست تھا۔ اردو پڑھنا اور لکھنا آتی تھی لیکن یہ ظاہر تھا کہ انھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ پھر بھی انہیں دیکھ کر کسی کو بھی یقین نہیں آتا تھا ان کا تعلق کسی غریب خاندان سے ہے۔ ویسے جتنے منہ اتنی باتیں۔ لوگوں کا تجسس لازمی تھا کیونکہ اچانک وہ ایک دن شہر کے باہر ایک دری میں اپنا سارا اثاثہ لپیٹے ہوئے وارد ہوئے تھے اور نیم کے نیچے حلوائی کی دکان کے سامنے پڑی ہوئی بنچ پر لپٹی ہوئی دری رکھ کر دو جلیبیاں اور چائے لے کر بیٹھ گئے تھے۔

ان کے انداز، ان کی شکل وصورت، گٹھے ہوئے کسرتی جسم کو کنکھیوں سے دیکھ کر حلوائی نے سوال کیا، ''کہاں سے آئے ہو میاں جی؟''

''گاؤں سے،'' انھوں نے مختصر سا جواب دیا۔

''کیا نام ہے تمہارے گاؤں کا؟'' حلوائی نے ذرا وضاحت چاہی مگر اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ خاموشی سے جلیبیاں کھاتے رہے۔ حلوائی کو بھی زیادہ سوال کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔

چائے ختم کر کے پاس کی دکان سے ایک پان اور بیڑیوں کا بنڈل خریدتے ہوئے انھوں نے پان والے سے پوچھا، ''کیوں جی، کیا نوکری ملے گی یہاں کہیں؟''

''کیسی نوکری؟'' پان والے نے دریافت کیا۔

''یہی کسی دکان پر مزدوری کی۔''

پان والے نے ان کی طرف نظر بھر کے دیکھا۔ ''تم مجوری کرو گے؟''

''کیوں نہیں، روزی کمانے کے لیے مزدوری کرنے میں کیا حرج ہے۔''

''مجوری کرنا ہے تو نانبائی کے پاس جا کر پوچھو۔ کل ہی اس کا لونڈا بھاگ گیا ہے۔ چوری کی تھی۔ نان بائی نے دو ایک چانٹے لگا دیے۔ بس ناراج ہو کر روتا ہوا نکل گیا۔ اب تک تو آیا نہیں۔ تم جا کر پوچھو شاید تم کو رکھ لے۔ تمہارا نام کیا ہے؟''

''نعمت خاں،'' انھوں نے جواب دیا اور لپٹی ہوئی دری اٹھا کر وہ نانبائی کی دکان کی طرف چل دیے۔

نانبائی اکیلے ہی سارا کام کرنے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ برتن اب تک نہیں مانجھے گئے تھے۔ تنور میں آگ جلا کر وہ مصالحے پیس رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا اکیلے ہی سارا کام کیسے کر لے گا۔ خود پر بھی اسے جھنجھلاہٹ ہو رہی تھی۔ ''دو چار آنے سالا چرا لیتا تھا تو کیا ہوا۔ بغیر دوسرا انتظام کیے لونڈے کو کیوں مارا۔'' اس نے سوچا، بارہ بجے اڈے تانگے والے بندھے ہوئے گاہک آئیں گے تو کیا ہوگا۔

پھر چوراہے والوں نے دیکھا کہ نعمت خاں نانبائی کی دکان کے اندر اپنا سامان رکھ کر برتن مانجھنے بیٹھ گئے۔ اس کے بعد ہاتھوں ہاتھ مصالحہ پیس ڈالا اور دکان صاف کر کے سارا کام سنبھال لیا۔ اور جب بندھے ہوئے گاہک کھانا کھانے آئے تو گوشت پک چکا تھا، دال بگھاری جا چکی تھی اور نانبائی تندور سے گرم گرم نانیں نکال رہا تھا۔ نیم کے درخت کے نیچے کھردری سی میز کے اردگرد گاہک آ کر بیٹھ گئے اور نعمت خاں نے موٹے موٹے کانچ کے گلاسوں میں پانی بھر کر ان کے سامنے رکھ دیا۔ تھوڑی دیر میں سالن وغیرہ بھی آ گیا۔ آج ہمیشہ کی طرح موٹی موٹی گالیاں دے کر انھیں لڑکے کو بلانا نہیں پڑا۔ یہ گالیاں ان کے لیے محض غصے کے اظہار کے لیے ہی نہیں بلکہ تفریح طبع کا بھی ذریعہ تھیں۔ سواریوں کی جھڑکیوں اور دل جلانے والی باتیں سننے کے بعد وہ گھوڑے اور لونڈے کو ہی گالیاں دے کر خوش

ہو لیتے تھے۔ لیکن نعمت خاں کو دیکھ کر انہیں گالیاں دینے کا خیال بھی ان کے ذہن میں نہیں آیا۔

''کیا نام ہے تمہارا جی؟'' انھوں نے سوال کیا۔

''نعمت خاں،'' انھوں نے مختصر سا جواب دیا۔

''کہاں کے ہو؟''

''گاؤں کے،'' پھر اتنا ہی مختصر جواب ملا۔

''کون ضلع سے آئے ہو؟''

''بہت دور سے۔'' یہ کہہ کر وہ پھر دوکان کے اندر چلے گئے۔

''یار یہ کہاں کا جنگلی پکڑ لائے ہو؟ بات کرنا ہی نہیں جانتا۔'' انھوں نے نانبائی سے شکایت کی۔

''ہاں جرا کم بات کرتا ہے، پر کام بڑھیا کرتا ہے،'' نانبائی نے جواب دیا۔

''ہے کہاں کا؟ سب معلوم کرلیا؟ آج کل کے جمانے میں جرا ہشیار رہنا چاہیے،'' انھوں نے نانبائی کو نیک رائے دی۔

''اجی جمانے کی بات نہ کرو۔ اس سالے لونڈے ہی نے کتنے پیسے چرائے معلوم نہیں۔ جب میں نے دو تھپڑ مارے تو بھاگ گیا۔ وہ تو کہو مجھے ترس آ گیا نہیں تو پولیس والوں کو دے دیتا،'' اس نے بات کا رخ بدل دیا۔ اور پھر وہ سب زمانے کی تبدیلیوں کا رونا روتے رہے جب تک کھانا ختم کر کے وہ لوگ چلے نہیں گئے۔

رات کو دکان بڑھاتے وقت نانبائی کو احساس ہوا کہ اس دن ذرا زیادہ ہی بکری ہوئی تھی۔ برتن بغیر کہے ہوئے منجھ گئے تھے اور جھاڑو دینے کے بعد صاف ستھری دکان دوسرے دن کے لیے بالکل تیار تھی۔

''تم کہاں رہتے ہو جی؟'' اس نے دکان بند کرتے ہوئے نعمت خاں سے پوچھا۔

''ابھی تو کہیں بھی نہیں۔ تم کہو تو درخت کے نیچے بنچ پر دکان کے سامنے سو جاؤں۔ کل ول کہیں کوٹھری ڈھونڈھ لوں گا۔''

نانبائی نے سوچا، اچھا ہے دکان کے سامنے سوئے گا چوری کا ڈر کم ہے۔ شکل سے تو شریف ہی لگتا ہے۔ نہ جانے کس مصیبت میں ہے۔ منہ سے بھی تو کچھ نہیں بولتا۔

اس کے بعد نعمت خاں نے اس رات ہی نہیں ساری گرمیاں دکان کے سامنے سو کر گزار دیں۔

نانبائی اور آس پاس کے دکان داروں کو ان کی خاموشی کی عادت سی ہوگئی۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ نعمت خاں کی ذات سے ہر ایک کو فائدہ ہی پہنچا تھا۔ ڈاکیہ گاؤں سے خط لاتا تو نعمت خاں ہی پڑھ کر سناتے اور اس کا جواب بھی وہی لکھتے۔ ''آپ کا خط ملا خیریت معلوم ہوئی۔ آگے احوال یہ ہے وغیرہ وغیرہ...'' انہیں کسی نے بحث کرتے یا زیادہ باتیں کرتے دیکھا تھا۔ صرف اپنے کام سے کام تھا۔ دوسروں کے جھگڑوں سے وہ دور ہی رہتے۔ صبح شام کا کھانا انہیں نانبائی سے ہی مل جاتا۔ کام کے لیے جو مزدوری پہلے دن سے طے ہوگئی تھی اسے نہ نانبائی نے بڑھایا اور نہ انھوں نے ہی اضافے کے لیے اس سے کچھ کہا۔ اس کے باوجود بھی سب جانتے تھے کہ ضرورت پڑنے پر نعمت خاں آڑے وقت کام آجاتے۔ وہ چھوٹا سا چوراہا ہی ان کی ساری دنیا تھا۔ لیکن انھوں نے کسی سے راہ ورسم نہیں بڑھائی۔

دکان بند ہونے کے بعد وہ چادر اوڑھ کر بنچ پر سوجاتے۔ ہاں کبھی کبھی سونے سے پہلے نعمت خاں ایک سگریٹ خریدتے اور لیٹے لیٹے اسے پیتے رہتے۔ اندھیرے میں جلتی ہوئی سگریٹ چنگاری کی طرح چمک اٹھتی اور اندازہ ہوتا کہ وہ اب تک سوئے نہیں ہیں۔

اس رات ہلکی ہلکی بارش ہورہی تھی۔ دکانیں بند ہوچکی تھیں اور دکاندار اپنے اپنے گھر جاچکے تھے۔ صرف نانبائی کی دکان کے سامنے برآمدے میں نعمت خاں کی جلتی ہوئی سگریٹ رہ رہ کر چمک اٹھتی تھی۔ اچانک چوراہے سے کچھ فاصلے پر شور سنائی دیا۔ پھر ایک بچے اور عورت کے رونے کی آوازیں آئیں۔ کچھ دیر بعد چند راہ گیر باتیں کرتے ہوئے دکان کے سامنے سے گزرے۔ ان میں سے ایک نے کہا، ''اپنی موت خود بلاتے ہیں۔ برسات میں زمین پر سونا تو بڑی حماقت ہے۔'' دوسرے نے کہا، ''ہر سال اتنی موتیں ہوتی ہیں لیکن ان کو عقل نہیں آتی''۔ تیسرے نے کہا، ''بڑا زہریلا تھا۔ اس کا کاٹا ہوا کہیں بچ سکتا ہے!''

پھر نعمت خاں کی آواز سنائی دی، ''صاحب کس کو کاٹا ہے سانپ نے؟''

راہگیر نعمت خاں کی آواز سن کر دکان کے سامنے رک گئے۔ ''شکورا دھوبی کے بیٹے کو۔ بچے گا نہیں وہ اب۔ بس ایک ہی لڑکا ہے سات بیٹیوں کے بعد۔''

شکورا کا نام سن کر نعمت خاں اٹھ بیٹھے۔ پھر کوٹھری کا دروازہ کھول کر اپنا چھوٹا سا ٹین کا صندوق

کھولا اور ایک تھیلی نکالی اور دروازے میں تالا لگا کر شکورا کی طرف چل دیے۔ وہاں کافی لوگ جمع تھے۔ شکورا کی بیوی لڑکے کا سر گود میں رکھے ہوئے زور زور سے رو رہی تھی۔ نعمت خاں نے شکورا کے پاس جا کر کہا، ''میرے پاس سانپ کے کاٹے کے لیے جڑی بوٹیاں ہیں، تم کہو تو انھیں استعمال کروں۔''

شکورا کی روتی ہوتی بیوی نے کہا، ''ہاں بھیا جو ہو کرو، بس کسی طرح یہ بچ جائے۔''

نعمت خاں نے کاٹی ہوئی جگہ کو شگاف لگا کر خون نکالنا شروع کیا۔ لڑکا چیخ چیخ کر رونے لگا۔ پھر ڈبیا سے سفوف نکال زخم میں بھر دیا اور پانی میں کوئی دوا ملا کر لڑکے کو پلانے لگے۔ اسپتال میلوں دور تھا۔ چوراہے کے قریب کے ڈاکٹر اپنے بھانجے کی شادی میں شام سے ہی مطب بند کر کے چلے گئے تھے۔ نعمت خاں کی دوائیوں اور ماں کی دعاؤں کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

رات ڈھلنے لگی لیکن لڑکے کو اب تک ہوش تھا۔ ایک ایک کر کے تماشائی جا چکے تھے لیکن نعمت خاں اب بھی مصروف تھے۔ انھوں نے کئی بار تھیلے سے نکال کر دوائیں دیں۔ سب کو یقین ہو گیا کہ لڑکا بچ جائے گا۔ صبح ہونے تک شکورا اور اس کی بیوی کے ساتھ بیٹھے رہے۔ لڑکا تھک کر سو گیا۔

نہ جانے یہ نعمت خاں کی جڑی بوٹیوں کا اثر تھا یا ماں کی دعاؤں کا، لیکن لڑکا بچ گیا۔ دوسرے دن چوراہے اور گردونواح میں خبر پھیل گئی نعمت خاں سانپ کے کاٹے کا علاج بھی جانتے ہیں اور شکورا کا بیٹا ان کے علاج سے بچ گیا۔ خبر سنسنی خیز ضرور تھی لیکن چوراہے والوں کو اس پر کچھ زیادہ تعجب نہیں ہوا۔ ان کے لیے نعمت خاں کی خاموشیوں میں نہ جانے کتنے راز چھپے ہوئے تھے۔

اس واقعے کے بعد گردونواح میں جب کسی کو سانپ کاٹتا ڈاکٹروں کو اور انہیں بلایا جاتا۔ وہ جلد سے جلد اپنی دواؤں کی تھیلی لیے ہوئے آموجود ہوتے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹروں سے ان کی کئی بار ملاقات ہوئی لیکن کسی بھی ڈاکٹر کو ان کی موجودگی پر اعتراض نہیں ہوا اور نہ انھوں نے دوا اور علاج کے لیے کسی سے معاوضہ لیا۔ کئی سال گزر گئے۔ چوراہے والے اب ان سے مانوس ہو چکے تھے بلکہ وہ ان کے احسان مند بھی تھے۔ آہستہ آہستہ ان کی شرافت، ان کی خاموشی، ان کی چھوٹی اور بڑی خدمات نے چوراہے اور اردگرد رہنے والوں کے دل میں اور بھی عزت قائم کر دی تھی۔

گرمی کا زمانہ تھا۔ ہیضے کی بلا گردونواح میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس قصبے اور آس پاس کے گاؤں میں کتنی جانیں اس کی نذر ہو چکی تھیں۔ نانبائی کی دکان کئی دن سے بند تھی۔ اس کے لگے بندھے گاہک بنچوں پر بیٹھے ہوئے تبادلۂ خیالات کرتے نظر نہیں آتے تھے۔ ویسے بھی سب ہیضے سے سہمے

ہوئے تھے۔

ایک دن نانبائی نے واپس آکر بتایا کہ اس کے دونوں بھائی جو کھیتی باڑی کی دیکھ بھال کرتے تھے ہیضے میں چل بسے۔ اس کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا جو گھر اور زمین کی دیکھ بھال کرتا۔ ایک دن وہ بھی ہمیشہ کے لیے دکان بڑھا کر چلا گیا۔

نعمت خاں کو دوبارہ تلاش معاش کی ضرورت ہوئی مگر اس بار انھوں نے کسی کی نوکری نہیں کی۔ کئی سال نانبائی کی نوکری کرنے کے بعد انہیں بھی کھانا پکانا آگیا تھا۔ چند دن بعد نانبائی کی دکان کے قریب ہی اینٹیں رکھ کر وہ سیخ کے کباب بنا کر بیچنے لگے۔ کباب چٹ پٹے اور مزیدار ہوتے تھے، ہاتھوں ہاتھ بک جاتے اور ان کے خرچ کے پیسے نکل آتے۔

کافی رات گئے کام ختم کر کے وہ اپنی کوٹھری میں چلے جاتے جو ان کے لیے شکورا دھوبی کی بیوی نے اپنے گھر کے پاس ہی ٹھیک کر دی تھی۔ اسی طرح ایک زمانہ گذر گیا۔ شکورا کی بیوی کہہ کہہ کر تھک گئی کہ ''بھیا نکاح کر لو، کوئی دو روٹی دینے والا تو ہو،'' لیکن اس تجویز کا جواب دینا بھی انھوں نے مناسب نہ سمجھا۔

ان کا معمول تھا کہ صبح اٹھ کر حلوائی کی دکان پر جاتے۔ دو جلیبیاں اور چائے کا ناشتہ کر کے بوری بچھا کر نیم کے درخت کے نیچے بیٹھ جاتے اور اگر کسی کو خط لکھوانا یا پڑھوانا ہوتا تو وہ ان کے پاس چلا آتا۔ دو پہر ہونے سے پہلے قصائی کی دکان سے کبابوں کے لیے قیمہ لے آتے اور پھر شام کے لیے کبابوں کی تیاری شروع کر دیتے۔ انھوں نے دکان کے پاس ہی ٹین کی چھوٹی سی چھت بھی ڈال لی تھی جہاں بارش ہونے پر وہ کباب سینکتے تھے۔ ان کے متعلق چوراہے والوں کو اب بھی کچھ نہیں معلوم تھا، لیکن ان کو ہر ایک کی ضرورت اور دکھ معلوم تھے۔ وہ اب بھی اس طرح سانپ کے کاٹے کا علاج کرتے تھے۔ ہر شخص کے دل میں ان کے لیے عقیدت تھی، مگر سب جانتے تھے کہ وہ کوئی پیر فقیر نہیں ہیں۔

اسی زمانے میں ایک دن لوگوں نے دیکھا کہ ایک لڑکا ان کے ساتھ چوراہے پر آیا۔ اس کے لیے بھی انھوں نے جلیبیاں اور چائے خرید دی۔ ان کے قریب ہی بیٹھ کر اس نے بھی ناشتہ کر لیا۔ جب شام کو نعمت خاں نے سیخوں پر کباب لگانے شروع کیے تو لڑکا کوئلے جلا کر انہیں پنکھے کی ہوا سے دہکتے ہوئے انگاروں میں تبدیل کر چکا تھا۔

شکورا نے لوگوں کو بتایا کہ لڑکا ان کی بیوی کا بھانجا ہے اور پیدائش ہی سے اس کا ایک پیر بیکار

ہے اس لیے کھیتی باڑی کے قابل نہیں اور چند دنوں کے لیے اپنی خالہ کے پاس آیا ہے۔ لیکن نعمت خاں کو دیکھتے ہی ان کے ساتھ اس طرح لگ گیا ہے جیسے انہیں بہت دن سے جانتا ہو۔ لڑکے کا نام نورا تھا۔ پھر اس کا معمول بن گیا کہ صبح صبح نعمت خاں کے ساتھ ناشتہ کرتا، شام کو دکان پر ان کی مدد کرتا اور رات کو اپنی خالہ کے گھر جا کر سو جاتا۔ اس نے خود ہی لوگوں سے کہا تھا، ''بڑے ہو کر نعمت خاں کی طرح سپیرا بنوں گا۔'' چائے والے نے مذاق کیا، ''نعمت خاں جانتے ہو، لونڈا کہتا ہے کہ تمہاری طرح سپیرا بنے گا۔ خاں صاحب سے تمہیں سپیرا بنا دیا اس نے۔ کیوں بے نورا!''

نعمت خاں نے نورا پر محبت آمیز نظر ڈالی۔ اس نے بھی مسکرا کر ان کی طرف دیکھا اور جلیبی ختم کر کے چائے پینے لگا۔ نعمت خاں حسب معلوم خاموش رہے۔

لوگوں نے دیکھا کہ دن ہو یا رات جب نعمت خاں سانپ کے کاٹے کا علاج کرنے جاتے تو نورا بھی ان کے ساتھ ہوتا۔ وہ دوائیاں وغیرہ دیتے تو وہ انہیں غور سے دیکھتا رہتا۔ یہ نہیں کہ جب کبھی نعمت خاں علاج کرتے تو انہیں کامیابی ہی ہوتی۔ بارہا ایسا بھی ہوا کہ وہ بڑی دیر کے بعد مریض کے پاس پہنچے اور اس کی حالت خراب ہو چکی تھی اس کے باوجود بھی وہ اپنی سی کوشش کرتے اور اس کے ختم ہو جانے پر خاموشی سے واپس چلے جاتے۔ یہ عجیب بات تھی کہ لوگوں کو ان کے علاج کی کامیابیاں ہی یاد رہتی تھیں۔ نورا بھی ان کا ذکر بڑے فخر سے کرنے لگا تھا، لیکن نعمت خاں کے سامنے نہیں، کیونکہ یہ انہیں پسند نہیں تھا۔ اگر وہ جڑی بوٹی یا دواؤں کی تھیلی اس کے ہاتھ میں دیتے تو اس کا چہرہ فخر سے چمک اٹھتا۔ وہ نعمت خاں کے ساتھ شہر میں جڑی بوٹیوں کی دکان پر بھی جاتا اور جب نعمت خاں انہیں خریدتے تو وہ خاموشی سے بیٹھا بیٹھا بڑے غور سے دیکھتا رہتا۔ نعمت خاں خوش ہوتے تو وہ اسے ان کی خاصیتیں بھی بتاتے۔

جاڑوں کا زمانہ تھا۔ مہاوٹیں پڑ رہی تھیں۔ ایک دن نعمت خاں اکیلے ہی صبح دکان پر آئے۔ کئی دن سے وہ کھانس رہے تھے لیکن اس دن ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور سانس بھی اکھڑا اکھڑا سا تھا۔

''طبیعت خراب ہے نعمت خاں؟'' حلوائی نے چائے کا آبخورہ دیتے ہوئے ہمدردی سے پوچھا۔ نعمت خاں حسب معمول خاموش رہے۔

''لونڈا نہیں آیا آج؟'' دکان دار نے کہا۔

''گاؤں چلا گیا ہے، اس کی ماں بیمار ہے،'' نعمت خاں نے کھانسی پر قابو پانے کی کوشش

کرتے ہوئے جواب دیا۔

اس دن وہ صرف چائے پی کر ہی اٹھ گئے۔ جلیبیاں دکان کے پاس بیٹھے ہوئے کتے کو دے دیں۔ اس دن نہ وہ بورا بچھا کر خط وغیرہ لکھنے کے لیے بیٹھے اور نہ ہی کباب تیار کیے۔ گاہک آ کر واپس ہوگئے۔ ٹین کی چھت کے نیچے دہکتے ہوئے انگاروں کی جگہ صرف بجھے ہوئے کوئلوں کا انبار تھا۔ دوسرے دن دکان داروں کو شکورا نے بتایا کہ ''نعمت خاں بخار میں بھن رہے ہیں۔ حالانکہ ڈاکٹر صاحب نے دوائی بھی دی ہے مگر ان کی طبیعت بڑی خراب ہے۔'' اسی طرح کئی دن گذر گئے۔ چوراہے والوں کو احساس ہوا کہ ایک خلا سا ہوگیا ہے جسے پُر کرنے والا کوئی اور نہیں تھا۔

اس دن صبح حسب معمول شکورا کی بیوی دلیہ پکا کر لے گئی تو دیکھا کہ نعمت خاں اس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ بہت کمزور ہوگئے تھے۔ ان کی بڑی بڑی آنکھیں ان کے ستے ہوئے چہرے میں اور بھی بڑی لگ رہی تھیں۔ ان کے سفید بال میلے تکیے پر پھیلے ہوئے تھے۔ انہیں دلیے یا دودھ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، دو چمچے کھا کر تھک کر لیٹ گئے۔ پھر شکورا کی بہو سے پوچھا، ''نورا ابھی تک گاؤں سے نہیں آیا؟''

''ابھی تک تو آیا نہیں،'' اس نے جواب دیا۔ ''اس کی اماں بیمار ہے۔ تم نے دلیہ کھایا نہیں؟''

نعمت خاں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''اچھا میں چل دی، استری کرنی ہے۔''

شام کو بھی انھوں نے کچھ نہیں کھایا۔ وہ بہت کمزور ہو چکے تھے۔ دوسرے دن وہ دلیہ اور دودھ لیے ہوئے پہنچی تو نعمت خاں جا چکے تھے، ہمیشہ کے لیے۔ ان کی آنکھیں اب بھی کھلی ہوئی تھیں جیسے کسی کا انتظار کر رہے ہوں۔ شکورا کی بیوی نے اپنے ہاتھ سے آنکھیں بند کر کے انہیں سیدھا لٹا دیا اور روتی ہوئی اپنے گھر چلی گئی۔ اس نے شکورا کو بتایا کہ ''نجانے کب رات کو نعمت بھیا چل دیے۔ جاؤ لوگوں کو خبر دے دو،'' اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

شکورا کی آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے اور وہ اٹھ کر چوراہے چلا گیا۔

نعمت خاں کی موت کی خبر بجلی کی طرح چوراہے کی چھوٹی سی برادری میں دوڑ گئی۔ ایک ایک کر کے ساری دکانیں بند ہوگئیں اور قرب وجوار سے بھی لوگوں نے آنا شروع کر دیا۔ مسجد کے امام صاحب بھی موجود تھے۔ کلمہ پڑھتے ہوئے لوگوں نے غسل دینے کے لیے نعمت خاں کو پلنگ سے اتارا

تو تکیے کے نیچے بوسیدہ سا سفافہ ملا جس میں کہ ایک خط اور چند پرانے نوٹ اور کالے تاگے میں بندھا ہوا سونے کا ایک چھوٹا سا تعویذ تھا۔ خط امام صاحب کے نام تھا۔

انھوں نے بآواز بلند حاضرین کو پڑھ کر سنایا۔

''جناب والا محمد تقی صاحب

''یہ حقیری رقم میرے کفن دفن کے اخراجات کے لیے ہے تا کہ خیرات کا کفن مجھ پر نہ ڈالا جائے۔ دوسری گزارش یہ ہے کہ تعویذ اور سانپ کے کاٹے کے علاج کی دوائیوں کا صندوق نورا کو دے دیا جائے، تا کہ بڑے ہوکر وہ انہیں خلق خدا کی خدمت کے لیے استعمال کرے۔ آپ سے استدعا ہے کہ آپ اور چوراہے والے میرے سارے عزیز میرے قصور معاف کردیں۔

''حقیر نعمت خاں۔''

خط ختم کر کے انھوں نے شکورا سے پوچھا، ''نورا کہاں ہے؟''

''وہ بیٹھا ہے،'' شکورا نے ایک روتے ہوئے دبلے پتلے لڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ امام صاحب نے تعویذ نورا کے گلے میں ڈال دیا۔ تقریباً دس بجے صبح غسل کے بعد نعمت خاں کا جنازہ قبرستان چل دیا۔ اب بھی کسی کو نہیں معلوم تھا وہ کہاں سے آئے تھے، کس خاندان سے ان کا تعلق تھا، مگر جنازے کے ساتھ ایک چھوٹا سا ہجوم تھا جس میں بلا امتیاز مذہب ہندو مسلمان سبھی شامل تھے۔ سب سے آخر میں لنگڑاتا ہوا نورا تھا۔ اس کی آنکھوں کے آنسو خشک ہو چکے تھے مگر اس کے گلے میں نعمت خاں کی آخری نشانی سونے کا تعویذ کبھی کبھی سورج کی روشنی میں چمک اٹھتا تھا۔

صداقت حسین خاں کی کہانی ان کی زبانی

میرا نام صداقت حسین خاں ہے۔ خدا کی قدرت ہے کہ جیسا میرا نام ہے ویسی ہی میری فطرت بھی ہے۔ میں شعروشاعری اور اس قسم کی لغویات سے نفرت کرتا ہوں۔ میری شخصیت کا سب سے روشن پہلو میری راست گوئی ہے۔ اس لیے یقین کیجیے کہ جو کہوں گا سچ کہوں گا۔ حالانکہ یہ واقعات ایسے ہیں جن پر شبہ بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی من گھڑت کہانی تو نہیں ہے، لیکن اس کا ایک ایک لفظ سچ ہے اور میری آنکھوں کے سامنے سارے واقعات گزرے ہیں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا میں راست گو آدمی ہوں اس لیے آپ کو سب کچھ سچ سچ بتادوں۔

حالانکہ میں مسلمان ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اسلام وہ مذہب ہے جو میں سمجھتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ بہت سے مذہبی رہنماؤں اور دانشوروں سے زیادہ میں نے اِس مذہب کو سمجھا ہے۔ اور یہ غرور کی بات نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ وہ لوگ میرے سامنے طفلِ مکتب ہیں۔ مجھے یقین ہے اسلام میں شراب پینا منع نہیں ہے بلکہ اس کی خرابیوں کا شکار ہونا ممنوع ہے۔ شاید آپ کو مجھ سے اتفاق نہ ہو۔ خیر، تو میں کبھی کبھی شراب کا شغل کرتا ہوں۔ غالب نے اپنے دیوان میں بہت سی حماقت کی باتیں لکھی ہیں۔ اور میرا خیال ہے خوامخواہ ان کو اس قدر اہمیت دی جاتی ہے، لیکن اس وقت ان کا ہی شعر یاد آگیا جو مجھ پر صادق آتا ہے:

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

میں بھی شراب پیتا ہوں تو اس لیے نہیں کہ غرضِ نشاط ہے۔ لیکن مجھے کبھی کبھی اک گونہ بے خودی کی ضرورت ہوتی ہے۔ میری زندگی میری راست گوئی کی وجہ سے ایسی تلخ ہوجاتی ہے کہ بس ایک آدھ وھسکی کا پیگ پی لیتا ہوں۔ لیکن میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اس سے کسی کو کوئی بھی نقصان نہیں پہنچتا۔ میں کمرے کو اندر سے بند کر کے وھسکی کی بوتل کھولتا ہوں اور جب تک میری بیوی دروازے پر بار بار دستک دے کر پریشان نہیں کردیتی میں دروازہ نہیں کھولتا۔ بار بار دستک دینے کی وجہ یہ ہے

کہ وہ چاہتی ہے کہ میں کھانا کھالوں اور وہ پیر پھیلا کر سوئے۔ اس میں شبہ نہیں عورتیں بڑی ہی عیش پرست ہوتی ہیں۔ میری بیوی بھی کسی سے کم نہیں ہے۔ اس کا بس چلے تو تنکا نہ توڑے۔ لیکن میں نے روزِ اوّل سے اسے بتادیا تھا کہ کاہلی اور تن آسانی سے مجھے بڑی نفرت ہے اور شادی کی رسمیں ابھی مشکل سے ہی ختم ہوئی تھیں کہ میں نے اسے کام پر بھیج دیا حالانکہ اس کی چھٹیاں ابھی ختم نہیں ہوئی تھیں۔ اس کی ہیڈ مسٹریس کو تعجب بھی ہوا کہ وہ اتنی جلدی کیوں واپس چلی گئی۔ لیکن سب عورتیں ایک سی ہوتی ہیں۔ شادی بیاہ اور دنیا بھر کی رسموں کا ڈھونگ انہیں بہت پسند ہوتا ہے۔ چاہے انہیں کتنا ہی پڑھایئے لکھایئے لیکن جناب فطرت نہیں بدلا کرتی۔ اسی لیے مجھے ان کی جنس سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ مجھے مرد اچھے لگتے ہیں لیکن سارے ایرے غیرے نتھو خیرے قسم کے لوگ نہیں۔ کوئی ہم خیال، ہم عمر پڑھا لکھا سمجھدار آدمی مل جائے تو بڑی خوشی ہوتی ہے۔ لیکن ایسے موقعے میری زندگی میں کم ہی آئے ہیں۔ بس ایک آدھ بار۔ جب میں ریسرچ کرنے امریکہ گیا تھا تو وہاں یونیورسٹی میں ایک دوست ملا تھا۔ کیا بتاؤں کیا خوبصورت نوجوان تھا۔ لڑکیاں پروانے کی طرح اس پر فریفتہ تھیں۔ لیکن اسے ان میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے تو پڑھنے لکھنے اور جسم بنانے کے لیے ورزش اور اپنے ہم عمر، ہم خیال مردوں کی دوستی چاہیے تھی۔ خاص کر میری دوستی۔ بس یہ سمجھ لیجیے ایک جان دو قالب تھے ہم۔ لیکن یہ ظالم دنیا کسی کو بھی خوش نہیں دیکھ سکتی۔ خدا معلوم لوگوں نے والدین کو کیا جھوٹ سچ لکھ دیا تھا کہ جب میں گرمیوں کی چھٹیوں میں وطن گیا تو والد صاحب نے حکم صادر کردیا، ''تم اب شادی کرلو، ہم نے لڑکی دیکھ لی ہے۔ میں نے صاف صاف منع کردیا کہ ''صاحب ابھی میری تعلیم ختم نہیں ہوئی ہے۔ میری کوئی آمدنی نہیں، میں ان جھگڑوں میں کیسے پڑسکتا ہوں۔'' وہ بھنا گئے۔ بولے، ''تم کو ان باتوں کی فکر نہیں کرنا پڑے گی۔ تمہارا فرض ہمارا حکم ماننا ہے۔ ہم تمہارے باپ ہیں دشمن نہیں۔'' اور بس، یہ کہہ کر کمرے سے نکل گئے۔

میں ان کے رعب میں کب آنے والا تھا۔ لیکن والدہ نے رو رو کر قیامت برپا کردی۔ بس ایک رٹ لگادی۔ ''شادی کرلو۔ شادی کرلو۔ اپنے باپ کو ناراض نہ کرو۔'' میں پھر بھی نہ مانا تو جناب انھوں نے بھوک ہڑتال کردی۔ دل کی مریض ہیں۔ سارا گھر والے، بھائی بہن میرے پیچھے ہاتھ دھوکر پڑگئے۔ کیا کرتا قہر درویش برجان درویش۔ میں پھنس گیا، لیکن میں نے ایک بار بھی اپنی ہونے والی بیوی کو دیکھنے کی خواہش ظاہر نہیں کی۔ میں جانتا تھا دیکھنے دکھانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بلکہ جب سسرال

والے مجھ سے ملنے آئے تو میں غسلخانے میں بند ہو کر بیٹھ گیا اور جب تک وہ چلے نہیں گئے میں باہر نہیں نکلا۔ لیکن ان باتوں سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ والدہ فاقہ کر کر کے ایسی کمزور ہوگئی تھیں کہ میں نے سوچا کہ جو بھی ہو ماننا ہی پڑے گا ورنہ ان کی موت کی ذمہ داری میرے گلے پڑ جائے گی۔

خیر صاحب مجھے باندھ بوندھ کر لے گئے۔ نکاح ہوگیا۔ رات کو اس نیک بخت یا بد بخت سے سامنا ہوا۔ وہ گڑیا بنی گھونگھٹ نکالے اس طرح ڈری بیٹھی تھیں جیسے میں جاتے ہی ان پر حملہ کردوں گا۔ کاش مجھ میں اتنی ہمت ہوتی کہ ان سے بتا دیتا کہ مجھے ان سے اور شادی بیاہ کے جھگڑوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ لیکن میرے برتاؤ سے ان کو یہ خود ہی سمجھ لینا چاہیے تھا۔ میں نے ان کا گھونگھٹ اٹھایا کیونکہ مجھے اس سے بڑی کوفت ہو رہی تھی، دیکھوں تو کس سے باتیں کر رہا ہوں۔ وہ بڑی سی نتھ پہنے چہرے پر غازہ پوتے ہوئے تھیں۔ ان کے چہرے اور بالوں پر افشاں چمک رہی تھی۔ صورت کی اچھی خاصی تھیں۔ اگر مجھ کو عورتوں میں دلچسپی ہوتی تو خوش ہو جاتا۔ لیکن میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں مجھے ان کی جنس سے ہی چڑ ہے۔ خیر تو میں نے ان سے کہا کہ آپ مجھ سے ڈریے ڈرائیے نہیں۔ میں آپ کو ہاتھ بھی لگانے والا نہیں ہوں۔ بس آپ یہ بتائیے آپ پلنگ پر سوئیں گی یا صوفے پر۔ جب وہ کچھ نہ بولیں تو میں نے سوچا، کون اس بحث میں پڑے۔ اس لیے میں کمبل لے کر صوفے پر سو گیا۔ سارے دن کے ہنگاموں اور حماقتوں کی وجہ سے بہت تھک گیا تھا اس لیے لیٹتے ہی ایسی نیند آئی کہ صبح ہوگئی۔ اٹھ کر دیکھا کہ میری بیوی گٹھری بنی پلنگ پر سو رہی ہیں۔ رو رو کر سرمہ وغیرہ چہرے پر پھیلا لیا تھا۔ خدا معلوم کس بات کا رونا تھا۔ میں نے تو چھوا بھی نہیں اور مشکل سے دو لفظ کہے تھے۔ میں غسلخانے چلا گیا۔ جب وہاں سے نہا کر تازہ دم ہو کر نکلا تو دیکھا سب کے سب منہ لٹکائے ہوئے ہیں۔ لاحول ولا قوۃ! میں ناشتہ کر کے باہر نکل گیا۔ والدین نے شادی کرنے کو کہا تھا وہ کر تو لی۔ اب اور کیا چاہیے؟

دو ایک دن بعد میری بیوی رسم کے مطابق اپنے گھر گئیں۔ مجھے بھی جانا پڑا۔ لیکن یہاں بھی سب کے چہرے ایسے اترے ہوئے تھے جیسے شادی نہیں کسی کی موت ہوگئی ہے۔ جب بیوی گھر آئیں تو میں نے سمجھایا، نیک بخت میں نے ماں باپ کی ضد پر شادی کی ہے، ورنہ مجھے اس رسم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن مجھے کچھ وقت دو کہ میں تم سے سمجھوتہ کرسکوں اور تم رونے دھونے کے بجائے اسکول جا کر پڑھانا شروع کردو تاکہ ذرا دل لگے۔

میری بات ان کی بھی سمجھ میں آ گئی۔ انھوں نے اسکول جانا شروع کر دیا۔ میری چھٹیاں ختم ہوگئیں تو میں امریکہ چلا گیا۔ میرا دل ہر چیز سے اچٹ گیا تھا۔ اپنے دوست کی محبت میں بھی اب مجھے خوشی نہیں ملتی تھی۔ خیر جیسے ہی میری ڈگری ختم ہوئی میں گھر واپس چلا گیا۔ نوکری مل گئی لیکن مجھے وہاں کوفت ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا ماں باپ عزیز واقارب کی آنکھوں میں کوئی سوال ہے جو وہ زبان پر نہیں لا رہے۔ اسی زمانے میں میری بیوی حاملہ ہوگئیں۔ بچہ ہونے کے بارے میں بعض احمقوں کا خیال بڑا رومانٹک ہوتا ہے لیکن انہیں کون بتائے کہ اگر اس میں کوئی صداقت ہوتی تو ہم برصغیر والوں سے زیادہ رومانٹک کوئی بھی قوم نہیں ہوسکتی تھی۔

خیر نو مہینے کے بعد بقول میری والدہ اور ساس کے چاند سا بیٹا ہوا۔ بیوی بھی نہال ہوگئیں جیسے انہیں کوئی کھلونا مل گیا ہو۔ ایمان کی بات ہے، مجھے بھی احساس ہوا کہ کچھ بھی ہو یہ میرا ہی بیٹا ہے۔ اس کی ذمہ داری میرے اوپر ہے اور میں نے امریکہ اور انگلینڈ دونوں ہی ملکوں میں نوکری کے لیے عرضیاں دے دیں۔ سائنس دانوں کی مانگ ہے، مجھے انگلستان میں نوکری مل گئی۔ اور ابھی میرا بیٹا سال بھر کا بھی نہیں ہوا تھا کہ ہم تینوں لندن آ گئے۔ میری تنخواہ ہم دونوں کے اخراجات کے لیے کافی تھی لیکن مکان وغیرہ خریدنے کی گنجائش نہیں تھی اس لیے میں نے اپنی بیوی سے کہا، ''تم بھی نوکری کے لیے عرضیاں دینا شروع کردو۔'' انھوں نے کہا، ''بچہ ابھی سال بھر کا بھی نہیں ہوا ہے، میں اسے کیسے چھوڑوں گی؟'' میں نے ان کی بات پر غور کیا، پھر کہا، ''ٹھہرو کالج میں پوچھوں گا لوگ کیا رائے دیتے ہیں۔ آخر اس ملک میں اتنی عورتیں کام کرتی ہیں وہ اپنے بچوں کی نرسری میں بھیجتی ہیں یا کسی عورت کا انتظام کرتی ہیں جو بچے کی دیکھ بھال دن میں کرتی ہے۔ تم بھی خبر لو کہ کوئی ایسا انتظام ہو جائے۔ ورنہ ساری عمر کرائے کے فلیٹ میں گزارنا پڑے گی۔'' انھوں نے رونا شروع کیا۔ ''میں تو اپنے بچے کو کسی کے پاس نہیں چھوڑوں گی۔'' مجھے روتی ہوئی عوت سے بڑی نفرت ہوتی ہے۔ عورت ویسے ہی کمزور ہوتی ہے، جسم کی بھی اور دماغ کی بھی۔ اس کی کمزوری سے مجھے نفرت ہے۔ مرد کی دماغی اور جسمانی طاقت سے عورت کا کوئی مقابلہ نہیں۔ ویسے بھی مرد بادشاہ ہے۔ شیر کو دیکھ لیجیے کیا شان ہے، کیا دبدبہ ہے۔ اس کے مقابل میں شیرنی کی کیا ہستی ہے۔ مرد اور عورت کا بھی ایسا ہی فرق ہے۔ میں کسی پر ظلم نہیں کرتا لیکن حماقت پر مجھے شدید غصہ آتا ہے اور بعض اوقات وہ میرے ضبط سے باہر ہو جاتا ہے اور ایسے موقعے پر میرا ہاتھ چھوٹ جاتا ہے۔ بس یہی ایک آدھ طمانچہ مار دیا۔ لیکن جب میری بیوی اس طرح

بلک بلک کر رونا شروع کرتی ہے جیسے میں نے کوئی بڑا ظلم کر دیا ہے تو میں نے کئی بار اسے دھن کر بھی رکھ دیا ہے۔ لوگ کہتے ہیں تعلیم یافتہ لوگ عورت پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔ ان کا واسطہ میری بیوی جیسی عورت سے نہیں پڑا ہے۔

خیر تو رو دھو کر میری بیوی نے دوسرے دن سے نوکری تلاش شروع کر دی کہ کوئی عورت بچے کی دیکھ بھال کے لیے مل جائے۔ قسمت اچھی تھی، نوکری اور عورت ایک ساتھ ہی مل گئی اور میری بیوی نے کام کی زندگی گزارنا شروع کر دی۔ دن بھر کام کرنے کے بعد وہ شام کو شاپنگ اور بچے کو ساتھ لے کر آتی ہے، پھر اسے نہلا دھلا کر سلا دیتی ہے۔ کھانا پکاتی ہے اور جب میں دن بھر کی مشقت کے بعد ایک آدھ پائنٹ بیئر پی کر آتا ہوں تو وہ مجھے کام کرتے ہوئے ملتی ہے۔ کھانا کھا کر میں اخبار وغیرہ پڑھ کر سونے چلا جاتا ہوں اور وہ برتن دھو کر کپڑوں پر استری وغیرہ کر کے سو جاتی ہے۔ دوسرے دن صبح اٹھ کر ہم اپنے اپنے کام پر چلے جاتے ہیں۔

مجھے پکا پکایا کھانا مل جائے، صبح استری کی ہوئی صاف قمیص مل جائے، گھر صاف رہے، بس۔ اس کے سوا میری کوئی مانگ نہیں۔ لیکن مجھے بدزبانی اور nagging سے بڑی نفرت ہے۔ جب کبھی میں نے اپنی بیوی کو مارا ہے وہ اس کی بدزبانی یا nagging پر مارا ہے۔ میرا بیٹا اب بڑا ہو گیا ہے اور اسے بھی احساس ہے کہ میں سخت لیکن fair آدمی ہوں۔

وہ اب پڑھ لکھ کر نوکری کر رہا ہے۔ کبھی کبھی ہم لوگوں کی خیریت پوچھنے آ جاتا ہے۔ بیٹی بھی ہمارے ساتھ نہیں رہتی۔ مجھ سے تو کم ہی بات چیت ہوتی ہے لیکن وہ دونوں اپنی ماں کے پاس آتے جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے انہیں اپنی ماں سے محبت ہے۔ لیکن وہ دونوں میرے قریب نہیں آ سکے ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کون میرے قریب ہے۔ میری بیوی؟ جی نہیں۔ وہ میری شریک حیات ہے۔ ہم دونوں ہی اس گھر میں برسوں سے رہ رہے ہیں جواب ہمارا ہے، لیکن ہمارے درمیان میں جو خلیج پہلے دن سے ہے وہ کبھی پُر نہیں ہو سکی۔ میری بیوی بھی نوکری کرتی ہے۔ اس نے ہمیشہ نوکری کی ہے۔ وہ گھر آ کر خانہ داری کے کام نبٹاتی ہے۔ کھانا پکاتی ہے۔ میرا انتظار کرتی ہے اور جب میں کام سے واپس آتا ہوں تو ہم دونوں خاموشی سے ایک ساتھ کھانا کھاتے ہیں۔ کھانا کھا کر میں ڈرائنگ روم میں آ کر اخبار پڑھتا ہوں، ٹیلی وژن دیکھتا ہوں۔ میری بیوی بھی برتن دھو کر باورچی خانہ صاف کر کے آ جاتی ہے۔ وہ کرسی پر بیٹھ کر کچھ بنتی رہتی ہے۔ ٹیلی وژن یا ریڈیو کے علاوہ اس کی تیلیوں کی ہی آواز

ہمارے درمیان میں ہوتی ہے، جیسے وہی ہم دونوں کی گفتگو ہے۔ رات ہم ایک ہی پلنگ پر سوتے ہیں لیکن اس کے باوجود ہم ایک دوسرے سے بہت دور ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے قریب آنے کا وقت کبھی آیا ہی نہیں۔

اس دن بھی اس نے میرے دروازے پر کئی بار دستک دے کر کہا، ''کھانا تیار ہے۔'' میں نے باورچی خانے میں جا کر دیکھا آج اس نے میز ذرا اہتمام سے لگائی ہے۔ میز پوش جو خاص موقعوں پر ہی نکلتا ہے میز پر بچھا ہے۔ اور اس پر وہ برتن لگے ہوئے ہیں جو دعوت کے موقعے پر استعمال کرنے کے لیے خریدے گئے تھے، حالانکہ ہمارے ہاں دعوت وغیرہ کا جھگڑا شاید ہی کبھی ہوتا ہے۔ میں نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا لیکن وہ کھانا نکالنے میں مصروف تھی۔ ہم دونوں کی ایک دوسرے سے باتیں کرنے کی عادت نہیں ہے۔ میں خاموشی سے کھانا کھانے لگا۔ وہ بھی میرے سامنے بیٹھ گئی۔ پھر میں نے اس کے چہرے کو دیکھا اور میں تعجب سے ہکا بکا رہ گیا۔ ایسا لگا جیسے ہم پچیس سال پہلے پہنچ گئے ہیں۔ وہ بالکل بدلی ہوئی لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اسی طرح غازہ لگا تھا جیسے شادی کی پہلی رات کو لگا ہوا تھا، جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ اس کے کھچڑی بال بالکل کالے تھے اور اس کے ماتھے پر افشاں چنی ہوئی تھی۔ ''یہ کیا ہے؟'' میں نے تعجب سے اس کے چہرے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''کیا؟'' اس نے بھی تعجب سے پوچھا۔

''تم نے اپنے چہرے پر کیا لگا رکھا ہے؟'' میں نے پھر سوال دُہرایا۔

اس نے اپنے چہرے کو ہاتھ سے پونچھ کر اپنا ہاتھ دیکھا۔ پھر مجھے دکھا کر بولی، ''کچھ بھی نہیں۔'' لیکن اپنی آنکھوں کو میں کیسے جھٹلا سکتا تھا۔ اس کے گال لال ہو رہے تھے۔ اس کے چہرے پر غازہ تھا اور ماتھے پر افشاں چنی ہوئی تھی۔ لیکن میں خاموش ہو گیا۔ کھانے کے بعد وہ میری طرف پیٹھ کر کے برتن دھونے لگی۔ پھر میں نے سنا وہ کہہ رہی تھی، ''یہ کھانا ہم دونوں کا آخری کھانا تھا۔ آخری بار ہم نے ایک ساتھ کھانا کھایا ہے۔ اب میں اس گھر کو چھوڑ دوں گی، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔'' پھر بھی میں خاموش رہا۔ جیسا کہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں مجھے بیکار کی باتوں سے بڑی نفرت ہے۔ پھر میں نے سنا وہ گھبرا کر کہہ رہی تھی، ''اے برف پڑ رہی ہے۔ وہ مجھے لینے کیسے آئیں گے؟'' اور وہ سسک سسک کر رونے لگی۔ مجھے رونے سے بڑی چڑ ہے۔ میں نے سوچا اگر برف پڑ رہی ہے تو رونے کی کیا ضرورت ہے۔ اس نے

پھر کہا، ''تم جانتے ہو میں جارہی ہوں۔ ہمیشہ کے لیے یہ گھر چھوڑ کر جارہی ہوں۔''
میں نے سوچا، اس کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ گھر چھوڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن میں نے پوچھا، ''کہاں؟''
وہ بولی، ''میں خودنہیں جانتی۔ وہ سب مجھے لے جائیں گے۔ لیکن اس برف باری میں وہ کیسے آئیں گے؟''
میں نے کھڑکی کھول کر باہر دیکھا۔ برف تو نہیں پڑرہی تھی لیکن چاروں طرف بڑی تاریکی تھی۔ میری بیوی سسک سسک کر رورہی تھی۔ میں نے اسے دلاسہ دینا چاہا لیکن خاموش ہی رہا۔ باورچی خانے کی گرمی اب سخت سردی میں تبدیل ہوگئی تھی۔
وہ بولی، ''میں سب کچھ طے کرچکی ہوں۔ سب تیاری کرچکی ہوں۔ میں باہر جاکر ان کا انتظار کروں گی۔ کہیں وہ آکر لوٹ نہ جائیں۔'' اور وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ اور میں سوچتا رہا اسے کیا ہوگیا ہے۔
کچھ دیر بعد وہ دروازہ کھول کر دوبارہ اندر آگئی۔ وہ فرکوٹ پہنے تھی۔ ہاتھ میں وہ شاپنگ بیگ تھا جسے وہ روز استعمال کرتی تھی۔ ''اب میں تیار ہوں،'' اس نے بیگ کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ ''اس میں میری ساری زندگی کا سرمایہ ہے۔ یہ میری چابیاں ہیں، تمھیں واپس کررہی ہوں۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے اب میں کبھی اس گھر میں نہیں آؤں گی۔''
''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔
''یہ گھر بہت ٹھنڈا ہے۔ اس میں قبرستان جیسی خاموشی ہے اور قبر جیسا اندھیرا ہے۔''
میں نے اسے تعجب سے دیکھا۔ وہ اپنی شادی کا جوڑا پہنے تھی۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔ لیکن افشاں اس کی پیشانی اور بالوں پر چمک رہی تھی۔
باورچی خانے کا دروازہ بند کرکے وہ باہر نکل گئی۔ میں نے باہر کا دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔ پھر میرے کانوں میں ایک گیت کی آواز آئی جسے بہت سی عورتیں مل کر گارہی تھیں۔ میں نے دروازہ کھول کر دیکھا وہ میری بیوی کی طرف آرہی تھیں۔ اب اندھیرا نہیں تھا۔ چاروں طرف صبح کا اجالا تھا۔ عورتیں اپنے ہاتھوں میں پھول لیے ہوئے تھیں۔ ایک معمر عورت لال کناری کی سفید ساڑی (۱) پہنے ان کے آگے آگے تھی۔ اس نے میری بیوی کے ہاتھ سے شاپنگ بیگ لے کر لان پر

---

(۱) بنگال میں سہاگن عورتیں لال کناری کی سفید ریشمی ساڑی خوشی کے موقعوں پر پہنتی ہیں۔

رکھ دیا۔ پھر اس کا فرکوٹ اتار کر بیگ کے قریب رکھ دیا۔ میں نے دیکھا میری بیوی بھی شادی کا جوڑا پہنے ہے، اس کی پیشانی پر افشاں چنی ہوئی ہے، ماتھے پر بندی بھی سرخ بلب کی طرح دمک رہی ہے۔ پھر چاروں طرف سے لوگ آنے لگے۔ ان میں ہر قوم اور ہر نسل کے لوگ شامل تھے لیکن وہ زیادہ تر نوجوان تھے۔ میں نے سوچا آگے بڑھ کر پوچھوں وہ کون ہیں، اور میری بیوی کو کہاں لیے جا رہے ہیں۔ میری نظریں اس بوڑھے گریک معمار پر جا کر رک گئیں جو ہمارے گھر کے ہی پاس رہتا تھا۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس سے پوچھا، ''تم سب میری بیوی کو کہاں لیے جا رہے ہو؟'' اس نے میری طرف اس طرح دیکھا جیسے وہ مجھے پہچانتا نہ ہو۔ پھر میرے مکان کی طرف اشارہ کر کے بولا، ''اس ٹھنڈے اور اندھیرے گھر میں وہ نہیں رہ سکتی۔ ہم نے اس کے لیے ایک نیا گھر بنایا ہے۔'' وہ تیزی سے چل کر ان میں شامل ہوگیا اور وہ سب نہ جانے کیا گاتے ہوئے آگے نکل گئے اور میں وہیں کھڑا رہ گیا۔ اور سوچتا رہا کیا یہ میرا فریب نظر ہے۔

رعنائیِ خیال

بچے اب جوان ہوگئے تھے۔ اس کا چھوٹا سا خاندان کرۂ زمین پر بکھر گیا تھا۔ برسوں کی مشقت کے بعد اب اس کے شوہر کی ایک سرکاری شعبے میں سب سے اعلیٰ عہدے پر تقرری ہوگئی تھی۔ خود اس نے دہلی کی سوسائٹی میں اپنے لیے ایک مخصوص مقام بنالیا تھا۔ اور اب وہ زندگی کے اس دوراہے پر کھڑی تھی جب جوانی ختم ہوجاتی ہے اور بڑھاپا اپنی بانہیں کھولے ہوے قریب سے قریب تر آتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہ ایسا مقام ہے جب عورت کے لیے یہ فیصلہ مشکل ہوجاتا ہے کہ زندگی کی آخری شاہراہ پر کس طرح گامزن ہو، دنیاوی مصروفیات میں وقت گزارے یا ان سے دستبردار ہوکر زندگی یادِ خدا میں بسر کرے۔ اگر اس کا اعتقاد مذہب پر ہوتا تب بھی ہندو مذہب نے کسی واضح راستے پر چلنے کے لیے عورت کی کچھ صاف صاف راہبری نہیں کی ہے، اور خاص طور پر اس جیسی عورت کی۔ وہ ہندو سماج کے متوسط طبقے میں پیدا ہوئی تھی۔ اس کے بچپن اور جوانی کی یادیں مذہب اور معاشرے کے جشنوں اور ان لوگوں کی زیادہ تر تھیں جنھوں نے آخری دم تک اپنے عقائد کو ایک نعمت کی طرح سینے سے لگا رکھا تھا۔ یہ عقائد ان کو ان گنت صدیوں سے سینہ بسینہ ورثے میں ملے تھے۔ ان پر شک وشبہ کرنا تو درکنار ان کے متعلق سوال کرنا بھی ان کے لیے جائز نہ تھا کیونکہ ان کو خوف تھا کہ جواب کی جستجو میں وہ کہیں ایک خوش کن اور جانی بوجھی شاہراہ سے بھٹک کر کسی سنگلاخ پر خار راستے پر نہ چلے جائیں۔ مذہب کی رو سے اس کی اب وہ عمر ہونے کو آئی تھی جب مرد سنیاس لیتے تھے اور پہاڑوں کی چوٹیوں، غاروں یا سرسبز بنوں میں کٹیاں بنا کر رہتے تھے اور اس علم کی روشنی میں جو انھوں نے ساری عمر جمع کیا تھا، زندگی کے مسائل اور اس کے دکھوں پر غور کرتے تھے۔ ان میں سے چند اس راہ پر نکل جاتے جہاں ان سے ہزاروں سال پہلے کپل وستو کا ایک شہزادہ پہنچا تھا۔ یہ مسائل ان کے لیے ایسی گرہ بن کر رہ جاتے جس کی عقدہ کشائی ان کے بس کی بات نہ ہوتی اور وہ دنیاداری کی بندشوں کو توڑ کر اس اٹل حقیقت کے سائے میں پناہ لیتے جس کے پُرشکوہ نغمے ویدوں نے گائے ہیں یا اس پُرفضا باغ میں نکل جاتے جہاں سورداس، میرا اور ودیاپتی کے گیت گونج رہے ہیں۔ لیکن جہاں تک عورت کا تعلق

ہے، جواب مبہم تھا۔
اپنی نانی دادی کی طرح پوجا گھر بنا کر اس میں صبح و شام بیٹھنا اس کے تصور میں بھی نہیں تھا۔ نہ ہی وہ ان امیر اور خوش حال عورتوں میں تھی جو قیمتی ساڑیوں میں ملبوس کافی کے گھونٹ لے لے کر غریبوں کے لیے چندہ جمع کرنے کی تجویزوں پر غور کرتی ہیں۔
جوانی میں لندن سے اس نے ایم فل کیا تھا۔ یہ ڈگری ایک طرح کا قرض تھی، جو اس کے شوہر دیپک رائے ادا کرنا چاہتے تھے۔ شادی سے پہلے اس نے کیلی فورنیا یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا۔ لیکن ساس سسر اور گھر کی دیکھ بھال، نئی نئی شادی کے بعد جذباتی اور حیاتیاتی تقاضوں کو پورا کرنے میں وہ دونوں ایسے محو ہو گئے تھے کہ اس کے لیے ان بندھنوں کو توڑ کر دو سال کے لیے امریکہ جیسے انجانے ملک میں جانا ممکن نہیں تھا۔ دونوں نے مل کر فیصلہ کیا تھا کہ چند سال بعد جب حالات اجازت دیں گے تو وہ امریکہ یا انگلینڈ جا کر کوئی کورس کرے گی، لیکن زمانہ گزرتا ہی گیا۔ دونوں کی زندگی اس قدر خوش گوار تھی کہ کورس کرنے کا خیال برابر ٹلتا رہا۔ پھر دو بچے ہو گئے۔ جب چھوٹے بچے کی عمر دس سال تھی، دیپک رائے نے اس کے ذہنی اور جذباتی جمود کو محسوس کرتے ہوے سوال کیا تھا، ''تم نے ایم فل کرنے کا ارادہ بالکل چھوڑ دیا ہے؟''
''ارادے تو ارادے ہوتے ہیں۔ کوئی ضروری نہیں کہ ہر ارادہ پورا ہو جائے،'' اس نے اکتائی ہوئی نظروں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
اس کا یہ موڈ وہ کافی دن سے محسوس کر رہے تھے۔ انھوں نے خوش دلی سے جواب دیا، ''ٹھیک ہے، انسان ہزاروں ارادے کرتا ہے۔ ان سب کو پورا کرنا تو ممکن نہیں۔ لیکن ایم فل کرنے کا ارادہ تو ان میں شامل نہیں ہے۔ بچے بڑے ہو گئے ہیں۔ پتا جی کی موت کے بعد اب ماں اتنی مصروف بھی نہیں ہیں۔ بچوں کی دیکھ بھال وہ کر لیں گی۔ گھر کا انتظام تم نے اتنے سلیقے سے کیا ہے کہ تمھاری غیر موجودگی میں بھی کسی کو پریشانی نہیں ہوگی۔ جاؤ تم لندن چلی جاؤ۔ وہاں انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن میں میرے ایک دوست بھی ریڈر ہیں۔ ان سے مدد ملے گی۔
''ہم دونوں نے الہ آباد سے ایم۔ اے کیا تھا۔ پھر وہ ریڈیو میں ملازم ہو گئے۔ ذرا انقلابی آدمی تھے، اس لیے دو سال کے بعد نوکری سے نکالے گئے۔ پھر وہ سیاسی حالات سے دل برداشتہ ہو کر انگلینڈ چلے گئے۔ وہیں رہ کر سائیکولوجی میں پی ایچ ڈی کرنے کے بعد نوکری مل گئی۔ ہندوستان

میں کوئی ایسی نوکری نہیں ملی جس میں ان کے مضمون اور قابلیت کا صحیح استعمال ہو سکے، اس لیے اب وہیں کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ بڑے خوش مزاج اور وجیہہ آدمی ہیں۔ لیکن نہ جانے کیوں اب تک شادی نہیں کی۔''

''کیا رنجیت کا ذکر کر رہے ہو؟ مجھے یاد ہے کہ تمہارے بڑے گہرے دوست تھے۔ سیاسی اختلاف کے باوجود بھی تم دونوں کی دوستی میں فرق نہیں آیا تھا۔ ایک زمانے میں تم دونوں میں خوب خط و کتابت بھی تو تھی۔'' اس نے بات کا رخ پلٹا۔

''تھی تو، لیکن ہم مرد زیادہ تر خط و کتابت کے معاملے میں کاہل ہوتے ہیں۔ مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں ان کو خط لکھ دوں گا کہ تم داخلہ لینا چاہتی ہو۔''

''تم کیسی باتیں کرتے ہو؟ ہماری شادی کو بارہ برس ہو گئے میں نے ایجوکیشن پر کوئی کتاب بھی سنجیدگی سے نہیں پڑھی۔ تم کہتے ہو ایم فل کر آؤں،'' وہ ذرا چڑ کر بولی۔

''کیوں، اتنی موٹی موٹی کتابیں سائیکولوجی پر لا کر پڑھتی ہو۔''

''وہ بات دوسری ہے، لیکن دوبارہ لیکچر سننا، کورس کی کتابیں پڑھنا اور امتحان دینا دوسری بات ہے۔''

''کوئی دوسری بات نہیں ہے۔ پھر تم کل ہی تو نہیں جا رہی ہو۔'' بات کا رخ بدل کر وہ پیار سے بولے۔ ''راج، میں اتنے دن سے دیکھ رہا ہوں تم اکتائی اکتائی رہتی ہو۔ میرا خیال ہے تم کو دماغی جدوجہد، ذہنی stimulous کی ضرورت ہے، ورنہ اس خوبصورت سر کے اندر جو جیتا جاگتا دماغ ہے نا، وہ سو جائے گا۔''

اس نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ اسے احساس ہوا انھوں نے سچّی اور دل کی بات کہہ دی ہے۔ اس نے ان کے بہت قریب آ کر ان کے شانے پر سر رکھ دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اسے اس وقت ان پر بہت پیار آ رہا تھا اور غصہ بھی۔ ''یہ میرے دل کا سارا حال جانتے ہیں۔ مالی، جسمانی، ذہنی، میری ساری ضروریات کو پورا کرنے کا بار بھی انھوں نے لے لیا ہے۔ کیا میں بالکل اپاہج ہو گئی ہوں؟'' اس نے ایک گہرا سانس لیا۔

دیپک رائے ان لوگوں میں تھے جو کسی بات کو لٹکائے نہیں رکھتے تھے۔ ایک بار جو ارادہ کیا اس کو اپنی حد تک عملی جامہ پہنانا ان کی فطرت میں داخل ہو گیا تھا۔ دوسرے ہی دن اسکالرشپ کے

لیے وہ فارم وغیرہ لے آئے۔ رات کو جب وہ ان کے مطالعے کے کمرے میں گئی تو دیکھا کہ وہ کسی کو خط لکھ رہے تھے۔

''اتنی رات گئے کس کو خط لکھ رہے ہو؟'' اس نے پوچھا تھا۔

''اپنے ایک عزیز دوست کو،'' وہ ذرا رازدارانہ لہجے میں مسکرا کر بولے۔

''رنجیت کو لکھ رہے ہو نا؟'' وہ بولی۔

''ہاں، تمہارے ہی بہانے سے اس سے خط و کتابت جاری ہو جائے۔ تم نے فارم بھر لیے؟ میں نے رنجیت کو لکھ دیا ہے کہ داخلے اور Subjects کے بارے میں لکھیں۔ ان کا مضمون بھی سائیکولوجی ہے۔ ان سے اچھی رائے کوئی اور نہیں دے سکتا۔ مجھے اطمینان رہے گا کہ تمہاری دیکھ بھال کرنے والا وہاں کوئی موجود ہے۔''

وہ چڑ کر بولی تھی، ''وہاں بھی ایک مرد کے سہارے کی ضرورت ہے؟ میں اپنی ذمہ داری خود نہیں لے سکتی۔ عورت ہوں نا؟''

دیپک رائے نے کہا تھا، ''کیسی باتیں کرتی ہو؟ بھرا پُرا گھر، مجھے اور بچوں کو چھوڑ کر پہلی بار اکیلی یورپ جاؤ گی۔ ہم سب کی یاد نہیں آئے گی کیا؟ میں جانتا ہوں۔ پہلے پہل دل بہت گھبرائے گا۔ ایسے میں کوئی جانا پہچانا اپنا مل جائے تو بڑا سکون ہوتا ہے۔ رنجیت میرے بھائی کی طرح ہے۔ مجھے یقین ہے تمہیں اس سے مل کر بہت خوشی ہوگی۔''

ان کی باتیں سن کر اسے شرمندگی ہوئی تھی۔ پھر بولی تھی، ''تم مجھے کیوں اتنی دور دھکیل رہے ہو؟ تم کو، بچوں کو، ماں جی کو چھوڑنے کو میرا دل نہیں چاہتا۔ پھر اگر میں نے ایم فل کر بھی لیا تو کیا تیر مارلوں گی؟ نوکری تو کر نہیں سکتی۔ اتنی عمر میں کون مجھے نوکری دے گا؟''

دیپک نے اس کی کشمکش سمجھ کر کہا، ''نہیں پاگل، نوکری کا سوال نہیں ہے۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تم نے سب کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ اب تم کو اپنے لیے بھی کچھ کرنا ہے۔ ایم فل تم یہاں بھی کر سکتی ہو۔ لیکن یورپ جا کر تمہارا واسطہ ایک دوسرے معاشرے، دوسرے ماحول اور لٹریچر سے پڑے گا۔ یہ ایک بڑا قیمتی تجربہ ہے۔ ابھی میں خط ختم کر کے آتا ہوں۔''

پھر ایک سال آنکھ جھپکتے گزر گیا۔ برٹش کاؤنسل سے اسے وظیفہ بھی مل گیا۔ رنجیت کے ذریعے سے داخلے میں بھی مشکل نہیں ہوئی تھی۔ دو سال بعد وہ ایم فل کر کے واپس آ گئی۔ ایک کالج میں بھی

پارٹ ٹائم لیکچرر شپ مل گئی۔ اور لندن کی یادیں ذہن میں دھندلا سی گئیں۔
آج وہ چند ضرورت کی چیزیں خریدنے کالج ہی سے بازار چلی آئی تھی۔ دکان دار کو پیسے دے کر اس نے مڑ کر باہر دیکھا تو ایک شخص تیزی سے دکان کے سامنے سے گزرتا ہوا نظر آیا۔ وہ صرف ایک ہلکی سی جھلک دیکھ پائی۔ لیکن وہ یقیناً کہہ سکتی تھی کہ وہ رنجیت تھا۔ وہی قد، وہی جسم، ویسے ہی بال، ویسا ہی چلنے کا انداز اور اسی قسم کی ٹویڈ کی جاکٹ۔
بغیر سوچے ہوئے وہ تیزی سے دکان سے باہر نکلی اور بڑے تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی اس شخص کے پاس پہنچ کر اس نے آواز دی، ''رنجیت!'' اس شخص نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ رنجیت نہیں تھا۔ اسے اپنے اوپر بہت غصہ آیا۔
''معاف کیجیے، میں نے آپ کو کوئی اور شخص سمجھا تھا،'' اس نے بڑے وقار سے انگریزی میں معافی مانگی۔ پھر بولی، ''شاید آپ کی جاکٹ دیکھ کر غلطی ہوئی۔ یہ انگلینڈ کی سلی ہوئی ہے نا؟''
اجنبی نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ پھر بولا، ''کوئی بات نہیں۔ آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ یہ جاکٹ لندن کی سلی ہوئی ہے۔ میرے بھائی وہاں رہتے ہیں۔ وہ میرے لیے لائے تھے۔ کیا آپ وہیں سے آئی ہیں؟''
اس نے کہا، ''جی نہیں۔ لیکن زمانہ گزر گیا وہاں گئی تھی۔'' اور پھر اجنبی سے دوبارہ معافی مانگ کر تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی واپس آ گئی۔
بازار سے باہر نکل کر اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ چیزیں پاس رکھ کر وہ کار میں چند منٹ کے خاموش بیٹھی رہی۔ ''کیا حماقت ہے!'' اس نے جھنجھلا کر سوچا۔ اس عمر میں کم عمر لڑکیوں کی طرح دوڑ کر ایک شخص کا پیچھا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر رنجیت ہندوستان آتے تو ہم سے ملنے نہ آتے، یہ کیسے ممکن تھا! پھر اس کے دل میں ایک خلش سی ہوئی۔ ''شاید نہ آتے۔ شاید نہ آتے۔'' اس نے زیرلب دہرایا۔ ''لیکن کیوں؟'' اس نے سوچا۔ یہ مرد ہم کو ایک معما سمجھتے ہیں۔ کیسی موٹی موٹی کتابیں عورتوں کی نفسیات اور ان کے کردار کے تضاد پر لکھ ڈالیں۔ لیکن کیا وہ اپنے آپ کو سمجھ سکتے ہیں؟ ہوں!'' اس نے سر ہلا کر کہا اور کار اسٹارٹ کر کے گھر کی طرف چل دی۔
دیپک کسی کانفرنس میں شرکت کرنے سویڈن گئے ہوئے تھے۔ گھر میں اس کے اور نوکروں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ گرمی کا زمانہ تھا، لیکن دوپہر کے حبس کے بعد شام کی ہوا میں تازگی اور راحت تھی۔

اگر وہ چاہتی تو شام گزارنے اپنی کسی دوست کے پاس چلی جاتی۔ لیکن اس نے گھر پر ہی رہ کر اگلے ہفتے کا لیکچر تیار کرنے کا ارادہ کیا۔ نہا کر بال سکھانے کے لیے وہ آئینے کے سامنے بیٹھی تھی۔ اس نے آئینے میں اپنا عکس دیکھا۔ اس کے گھنگرالے بال اب بھی کالے تھے۔ صرف چند سفید بال چاندی کی طرح چمک رہے تھے۔ وہ ان عورتوں میں تھی جن کے چہرے پر وقت اپنی مُہر جلدی نہیں لگا پاتا۔ اس کا چھریرا بدن اب ذرا گداز ہوگیا تھا۔ اس میں اب بھی کشش تھی۔ آئینہ دیکھ کر وہ مسکرادی۔ پھر بالوں کا ڈھیلا سا جوڑا بنا کر اس نے پہننے کے لیے ساڑی نکالی۔ وہ پرانی اور نئی ساڑیوں کو الٹتی پلٹتی رہی۔ پھر ڈھاکے کی ململ کی ایک ساڑی نکال کر پہنی اور قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ اپنا عکس دیکھ کر اسے دھکا سا لگا۔ یہ تو وہی ساڑی تھی جو رنجیت کو بہت پسند تھی۔ اس ساڑی میں اسے ملبوس دیکھ کر اس نے کہا تھا، ''اس ساڑی میں تمہارا گندمی رنگ سونے کی طرح چمک رہا ہے۔'' پھر بڑے پیار بڑی نرمی سے اس کے لبوں نے اس کے گال کو چھولیا تھا۔

''مجھے کیا ہوگیا ہے؟'' اس نے خود سے سوال کیا۔ ''دو جوان بیٹے ہیں، چاہنے والا شوہر ہے اور میں ایک رومانٹک نوعمر لڑکی کی طرح ایک غیر مرد کے متعلق سوچ رہی ہوں۔'' اس کے جذبات اس کے خیالات اس کے لیے معما بن گئے تھے۔ لیکن اسے نہ احساس گناہ تھا اور نہ وہ اس محبت پر شرمندہ تھی جو ایک زمانہ گزر گیا اس نے ایک دور دیس کے باسی سے کی تھی۔ اسے کتنے ایسے موقعے یاد آئے جب دوسرے مردوں نے اس کے پاس آنے کی کوشش کی تھی، لیکن اس نے انہیں قریب آنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ گرمیوں کی اس خوش گوار شام کو باغ میں بیٹھی بیٹھی وہ ان کے متعلق سوچتی رہی تھی، ان کے چہرے یکے بعد دیگرے ان کے سامنے آتے رہے۔ ان میں سے چند ایسے بھی تھے جن کو اس نے خود بھی بڑا جاذب پایا تھا۔ پھر اسے مائیکل یاد آیا۔ کیسا حسین لڑکا تھا۔ بالکل یونانی دیوتا کے بت کی طرح — سنہرے گھنگھرالے بال، نیلی نیلی آنکھیں، دراز قد، ہونٹوں پر جیسے ہر وقت مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ لندن میں اس کے ہی ہوسٹل میں چند کمروں کے فاصلے پر رہتا تھا۔ پہلے دن ہی مائیکل اس سے بڑی محبت سے پیش آیا تھا۔ وہ اپنے شوہر، دونوں بچے اور ہر مانوس چیز کو چھوڑ کر ایک نئے اور عجیب وغریب ملک میں رنگ برنگے طالب علموں کے درمیان گھری ہوئی اکیلی ہی اکیلی بیٹھی ہوسٹل کا بد ذائقہ کھانا کھانے کی کوشش کررہی تھی۔ اسے اپنا چھوٹا بیٹا یاد آرہا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ ہر لقمہ اس کے گلے میں اٹکا جارہا ہے۔

''کھانا بہت خراب ہے نا؟'' اس کے پاس بیٹھے ہوئے ایک لڑکے نے اس سے سوال کیا۔
وہ اپنی دنیا میں ایسی غرق تھی کہ اسے معلوم بھی نہیں ہوا کہ وہ کب اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا تھا۔

''نہیں،'' اس نے سر ہلا کر جواب دیا۔

''جھوٹ، بالکل جھوٹ،'' لڑکے نے ہنس کر بڑی صاف گوئی سے جواب دیا تھا۔ پھر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا کر کہا تھا، ''میرا نام مائیکل ہے۔ میں تمہاری کلاس میں ہوں۔ ہم دونوں کے Subject بھی ایک ہیں۔ تم نے تو میری طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا لیکن ہم لڑکے ہر خوبصورت لڑکی کا نام اور اس کی شکل دل پر نقش کر لیتے ہیں۔'' وہ پھر ہنسا۔ ''تمہارا نام راجیشری رائے ہے نا؟ میرے لیے یہ نام ذرا مشکل ہے۔ میں تمہیں راج کہہ کر پکاروں گا۔ کوئی اعتراض تو نہیں؟'' مائیکل کی ہنسی اور اس کی خوش مزاجی نے اس کے دل پر چھایا سا رکھ دیا۔

وہ سر ہلا کر بولی، ''کوئی اعتراض نہیں۔ میرے سارے دوست مجھے راج کہتے ہیں۔''

''شکریہ۔ شکریہ۔ تو میں دوستوں کے حلقے میں شامل ہو گیا۔ اب بھولنا نہیں۔''

''ہرگز نہیں،'' وہ مسکرا کر بولی۔ اس دن سے ان کی دوستی ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی لیکچر ختم ہونے کے بعد وہ پارک میں بیٹھ کر طرح طرح کی باتیں کرتے تھے۔ اس نے مائیکل کو دیپک اور اپنے بیٹوں کی تصویریں دکھائی تھیں۔ بچوں کے خط پڑھنے کو دیے تھے۔ مائیکل نے اس سے اپنی بہنوں اور والدین کے متعلق باتیں کی تھیں۔ وہ اسکاٹ لینڈ سے آیا تھا اور اس کا انگریزی بولنے کا لہجہ اسے بڑا اچھا لگتا تھا۔ جب وہ خالص گلاسگو کے لہجے میں باتیں کرتا تھا تو اس کے پلے کچھ نہ پڑتا تھا اور مائیکل کہتا، ''ارے تم بڑی جاہل ہو۔ گلاسگو کی بولی نہیں سمجھتیں۔ سب سے پہلے تو تم کو اسکاٹ لینڈ ہی جانا چاہیے تھا۔ ہم اسکاٹ لینڈ والے ہی تمہارے دوست ہیں۔ ان انگریزوں نے تو ہم دونوں کا خون چوسا ہے۔''

وہ کہتی، ''تو تم کیوں یہاں آئے ہو اسکاٹ لینڈ چھوڑ کر؟''

''ارے ہم مردوں کی بات دوسری ہے۔ ہم شیر ہیں، جنگل کے بادشاہ۔ جہاں چاہیں جائیں،'' اسے چڑانے کے لیے مائیکل نے کہا تھا۔

مائیکل کے لیے لڑکیوں کی کمی نہیں تھی۔ اپنے ہم عمر لڑکے لڑکیوں کی طرح اس کی بھی اخلاق

قدریں نئی تھیں۔ لیکن اس نے کبھی دوستی کی حد سے قدم باہر نہیں رکھا تھا۔ اسے معلوم تھا وہ شادی شدہ ہندوستانی عورت ہے اور لاکھ اپنے پرانے معاشرے کی بندشوں سے آزاد سہی، وہ کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتا تھا جس سے ان کی دوستی کو ضرر پہنچے۔

اسے یاد آیا، جاڑوں کی ایک شام کو وہ دونوں ہوسٹل کے کامن روم میں آگ کے قریب بیٹھے کیٹس اور دوسرے رومانٹک شعرا کی نظمیں پڑھ رہے تھے۔ کتاب ایک ہی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب بیٹھے تھے۔ مائیکل نے ایک نظم ختم کرنے کے بعد اس سے کہا تھا، ''اب تم پڑھو۔''

اسے خیال ہوا مائیکل کی آواز بھاری ہوگئی ہے اور اس کے چہرے پر ایک غبار سا آگیا ہے۔

اس وقت رات کے تقریباً نو بجے تھے۔ طلبا اپنے اپنے کمروں چلے گئے تھے یا اب تک لائبریری اور سنیما وغیرہ سے نہیں لوٹے تھے۔ وہ دونوں اکیلے تھے۔ مائیکل کا بازو اس کی پشت پر تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے صوفے کی پشت پر سر رکھے بڑے انہماک سے نظم سن رہا تھا۔ جب نظم ختم ہوگئی تو اس نے آنکھیں کھول اس کی طرف دیکھا، پھر کہا تھا، ''چلو، میرے کمرے میں چلو۔''

''کیوں؟ اتنے آرام سے تو یہاں بیٹھے ہیں،'' اس نے معصومیت سے کہا تھا۔

مائیکل نے اس کے بہت قریب آکر آہستہ سے کہا تھا۔ ''کیوں کہ آج رات میں تم کو جی بھر کے پیار کرنا چاہتا ہوں۔''

اسے یاد آیا وہ مائیکل پر ناراض نہیں ہوئی تھی۔ وہ یورپ کے معاشرے کے اصولوں کو اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ اسے صرف ڈر لگا تھا کہ ان کی ایسی خوب صورت دوستی ختم ہو جائے گی۔ اسے یاد آیا جس دن وہ ہندوستان چھوڑنے والی تھی، اس رات دیپک نے بھی اسے دل بھر کے پیار کیا تھا۔ پھر کہا تھا، ''ہم دونوں ایک دوسرے سے دو سال کے لیے الگ ہو رہے ہیں۔ نہ میں سنیاسی ہوں اور نہ تم سے اس کی توقع کرتا ہوں۔ اگر اس عرصے میں چند لمحوں کے لیے ہم کہیں سہارا لے لیں تو وہ کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ نہ میں تم سے پوچھوں گا نہ تم مجھ سے سوال کرنا۔''

اس نے جواب دیا تھا، ''تمہارا دماغ خراب ہے۔''

اس دن اس نے مائیکل کی طرف نظر بھر کر دیکھا تھا۔ وہ کیسا جاذب نظر جوان تھا۔ لیکن وہ ایک ہندوستانی عورت تھی۔ دو بیٹوں کی ماں۔ دوستی کی حد کو عبور کرنے کا خیال اسے ایک لمحے کے لیے

بھی نہیں آیا تھا۔

وہ مسکرا کر بولی تھی، ''مائیکل تم بڑے خوبصورت ہو۔ مجھے تم سے بڑی محبت ہے۔ لیکن یہ محبت ایسی ہے جیسی ماں کو بیٹے سے ہوتی ہے۔'' اس نے مبالغہ کیا تھا۔

مائیکل زور سے قہقہہ لگا کر کہا تھا، ''ارے تم بڑی دقیانوسی عورت نکلیں۔ کیا عمر ہے تمہاری؟''

''۳۴ سال،'' اس نے ایک سال اور بڑھا کر بتایا تھا۔

مائیکل دوبارہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ ''جانتی ہو میری عمر کتنی ہے؟ میں پچیس سال کا ہوں۔ تو تمہارے ملک میں نو سال کی لڑکیاں ماں بن جاتی ہیں؟'' اس نے طنزاً کہا تھا۔

اور وہ ذرا شرمندہ ہوکر بولی تھی، ''خیر، ماں نہ سمجھو بڑی بہن سمجھ لو۔''

مائیکل صوفے سے اٹھ کر اس کے سامنے کھڑا ہوگیا تھا۔ ''راج، اس قسم کی حماقت کی باتیں نہ کرو۔ یہ میری غلطی تھی کہ میں جذبات کی رو میں بہہ گیا اور بھول گیا کہ تم ہندوستانی عورت ہو۔ کتنے بھی دعوے کرو، تمہاری اخلاقی قدریں اب تک بڑی دقیانوسی ہیں۔'' اور ہنس کر اس کی پیشانی کا بوسہ لے کر کہا تھا۔ ''شب بخیر دیدی۔'' (اس نے ہندی کے چند الفاظ اس سے سیکھ لیے تھے) اور زینے پر چڑھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ لیکن وہ بڑی دیر تک وہیں بیٹھی رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے دو آنسو ڈھلک گئے تھے۔ اس نے سوچا تھا کیسی اچھی دوستی تھی، آج ختم ہوگئی۔ لیکن دوسری صبح مائیکل نے اسی طرح ہنس ہنس کر باتیں کی تھیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا تھا اور سوچا تھا یہ یورپ والے بھی کیسے عقل مند ہیں۔ زمانے کے ساتھ انھوں نے اپنی اخلاقی قدریں بدل کر زندگی کتنی آسان کرنے کی کوشش کی ہے۔

مائیکل کو یاد کر کے وہ مسکرائی۔ اب اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ نوکر نے اس سے آکر کہا، ''کھانا تیار ہوگیا ہے میم صاحب، میز پر لگا دوں؟'' اور وہ اٹھ کر اندر چلی گئی تھی۔

کھانا کھا کر رات گئے تک وہ اگلے ہفتے کا لیکچر تیار کرتی رہی۔ کام ختم کرنے کے بعد جب اس نے گھڑی کی طرف دیکھا تو ایک بج رہا تھا، لیکن وہ اب تک تھکی نہیں تھی۔ کام ختم کر کے جو اطمینان اور سکون اسے ہو رہا تھا، اس میں بڑی لذّت تھی۔ وہ زیرِ لب گنگناتی ہوئی اٹھی۔ اس نے کاغذات اور کتابوں وغیرہ کو سلیقے سے رکھنا شروع کیا۔ پھر وہ ایک دم رک گئی۔ وہ ایک گیت گنگنا رہی تھی جو رنجیت کو بہت پسند تھا۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوکر کھڑی ہوگئی۔

کالج میں وہ سائیکولوجی کی لیکچرر تھی۔ اگر وہ چاہتی تو بڑے ٹھنڈے دل سے اپنا نفسیاتی تجزیہ کرنے کی کوشش کرسکتی تھی، لیکن ان جھگڑوں میں پڑنے کی اسے ذرا بھی خواہش نہیں تھی۔ جو موڈ اس پر چھایا ہوا تھا، اس میں نشہ تھا، لذت تھی، ایک طلسم تھا جسے وہ توڑنا نہیں چاہتی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کے قدم کتابوں کی اس الماری کی طرف بڑھے، جہاں تصویروں کے البم رکھے ہوے تھے۔ اس نے اس البم کو نکالا جس میں لندن کے قیام کی تصویریں تھیں۔ اس کے ہاتھ ورقوں کو پلٹتے رہے۔ پھر اس کی نظریں ایک تصویر پر جم گئیں، جو ایک پکنک کی تھیں۔ کتنے جانے پہچانے چہرے تھے اس میں۔ زندگی کے بہت ہی قلیل عرصے کے لیے اس میں سے کئی اس کے کتنے عزیز دوست ہو گئے تھے۔ اب وہ کہاں ہیں؟ اپنے کاموں میں مصروف ہیں، اپنی اپنی دنیا میں محو ہیں۔ اسے خیال آیا، جہاں وہ ہیں وہی مقام، وہی لمحے ان کے لیے سب سے اہم ہیں۔ ان کے لیے کرۂ زمین کا محور بھی وہیں ہے۔ اس نے چند ورق پلٹے، پھر رک گئی۔ رنجیت کی تصویر اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں چشمے کے پیچھے سے جھانک رہی تھی۔ تصویر کے نیچے لکھا ہے:

To my friends Raj and Deepak

یہ تصویریں خاص طور پر انھوں نے دیپک کے لیے بھیجی تھیں۔ ان سے ملے ہوے ایک عرصہ ہو گیا تھا۔ دیپک نے انہیں لکھا تھا، اپنی ایک تصویر بھیج دو تاکہ معلوم ہو تم کتنے بدل گئے ہو۔ بے جانے بوجھے اس کی انگلیاں تصویر کے نقوش پر چلتی رہیں۔ پھر اس نے آہستہ سے البم بند کر کے رکھ دی اور کپڑے بدل کر سو گئی۔

ابھی مشکل سے پانچ بجے ہوں گے کہ اس کی آنکھ کھل گئی اور وہ باوجود کوشش کے بھی دوبارہ سو نہ سکی۔ باغ میں اب تک رات کا دھندلکا چھایا ہوا تھا۔ باورچی خانے میں جا کر اس نے چائے بنائی اور کھانے کے کمرے میں بیٹھ کر پینے لگی۔

چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ نوکر ابھی تک سو رہے تھے۔ گھر میں کوئی نہیں تھا۔ لیکن اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اکیلی نہیں ہے۔ یادوں کا ایک سمندر تھا، جو اس کی طرف بڑھتا آرہا تھا۔ اس نے محسوس کیا وہ اس کے ریلے میں بہہ گئی ہے۔

اسے اپنا بچپن یاد آیا۔ اپنے ماں باپ یاد آئے۔ اپنی ماں کا چہرہ اس کی آنکھوں میں گھوم گیا۔ اس زمانے کا جب وہ جوان تھیں، حالانکہ اس نے کبھی انہیں جوان نہیں سمجھا تھا۔ ان کے کالے کالے

گھنگھرالے بال اسی کے بالوں کی طرح تھے بلکہ اس کا چہرہ ان کے چہرے سے کتنا ملتا تھا۔لیکن وہ کتنی مہان تھیں، کتنی معصوم اور نیک تھیں۔اس کی اور ان کی کیا برابری! پھر اسے خیال آیا ہم اپنے والدین پر نیکی، بڑائی اور معصومیت کا کتنا بار رکھ دیتے ہیں۔ہم انہیں ایک بہت بلند مقام پر بٹھا دیتے ہیں اور خود بھی اس مقام پر پہنچنے کی خواہش کرتے ہیں۔شاید اپنی سطح سے بلند ہوکر اپنے آدرشوں تک پہنچنے کا یہ بھی ایک ذریعہ ہے؛ لیکن یہ مقام جہاں وہ ہماری نظر میں ہیں وہ حقیقت پر کم اور خواہشات پر زیادہ مبنی ہے۔اسے خیال آیا: میرے دونوں بیٹے بھی کیا اپنے ذہن میں میری ایسی ہی خیالی تصویر لیے ہوئے ہیں جیسی میرے دل میں میری ماں کی ہے؟ لیکن وہ عورتیں جو کسی کی محبوبہ تھیں، کسی کی بہن تھیں، کسی کی ماں بھی تھیں۔محبت کرنا اور محبت کا جواب دینا اگر کوئی گناہ ہوتا تو ہم نے اس کے گیت کیوں گائے ہیں؟ ان پر کیوں سر دھنا ہے؟ انسان کا عشق روحانی اور جذباتی ہی نہیں، جسمانی بھی ہوتا ہے۔ہم حواس کا سہارا لے کر ہی ہر چیز کو محسوس کرتے ہیں۔

چائے کی پیالی سامنے رکھے وہ خاموش بیٹھی رہی اور اس کے خیالات بھٹکتے رہے۔اسے رنجیت کی یاد آئی۔ان سے پہلی ملاقات کی یاد آئی جب وہ اسے ایرپورٹ لینے آئے تھے۔انہیں ایک دوسرے کو پہچاننے میں مشکل نہیں ہوئی تھی، لیکن وہ ان سے بڑی جھجک کر ملی تھی۔ حالانکہ اس اجنبی ملک میں وہی ایک ایسے شخص تھے جن سے اس کے اپنے ملک اور دیپک کی یادیں وابستہ تھیں، لیکن رنجیت اس سے بڑی گرم جوشی سے ملے تھے۔ اسے ہوسٹل لے گئے تھے اور پھر شام کو آکر ایک ہندوستانی ریستوران میں کھانے کے لیے لے گئے تھے۔ وہ دونوں کافی دیر تک ہندوستان، وہاں کی سیاست اور پرانے دوستوں کے علاوہ دیپک اور اس کے بچّوں کے متعلق باتیں کرتے رہے تھے۔ ہوسٹل واپس آکر اس نے دیپک کو خط میں لکھا تھا، ''تم سے رنجیت کے بارے میں اتنی بار سُنا تھا، لیکن ان سے مل کر اور باتیں کر کے معلوم ہوا تم دونوں کی دوستی کی وجہ کیا ہے۔تم دونوں کے سوچنے، باتیں کرنے کا انداز ایک دوسرے سے اتنا ملتا ہوا ہے کہ انہیں دیکھ کر ایسا لگا جیسے وہ تمہارے بھائی ہوں، اور انہیں دیکھ کر تمہاری یاد اور بھی آئی۔تم نے ٹھیک کہا تھا، تم سب کو چھوڑ کر میں بہت دکھی ہوں گی۔بچّوں کو یاد کر کر کے میرا دل تڑپ اٹھتا ہے۔تم نے اتنی دور کیوں مجھے بھیج دیا اور میں کیوں راضی ہوگئی؟ لیکن اتنی بڑی قربانی دے کر میں یہ موقع برباد نہیں کر سکتی۔اس لیے کام ہی میرا سہارا ہے اور کام ہی میں مجھے سکون ملے گا۔لیکن تمہارے ہر خط کے انتظار میں میری آنکھیں لگی رہیں گی۔''

ٹرم (term) شروع ہوتے ہی اس نے بڑے انہماک سے کام شروع کردیا۔ اسے اندازہ ہوا کہ حالانکہ کالج چھوڑے ہوئے ایک زمانہ گزر گیا تھا، لیکن اپنی ذہانت اور محنت کی وجہ سے اس کا شمار کالج کی اچھی طالباؤں میں ہونے لگا۔ اس کے نوٹس، اس کے ٹیوٹوریل دیکھ کر رنجیت کے دل میں بھی اس کی عزت بڑھی اور اسے محسوس ہوا کہ ان کی دوستی ایک دوسرے کی عزّت کی مستحکم بنیاد پر قائم ہوگئی ہے۔ بچوں کے خطوط اور دیپک کے بڑھاوے کی وجہ سے ایک سال کا عرصہ اس نے صبر سے گزار دیا۔ دوسرے سال اسے محسوس ہوا کہ وہ ہوسٹل میں اتنی اچھی طرح کام نہیں کرسکتی جتنا وہ چاہتی تھی۔ کالج کے پاس ہی اسے رنجیت کے ذریعے سے کمرہ مل گیا اور وہاں جا کر اس نے ساری تفریحوں کو بھلا کر اپنا سارا وقت پڑھنے لکھنے میں صرف کرنا شروع کردیا تھا اور ایک دن جب وہ کالج سے واپس لوٹ کر آئی تو احساس ہوا کہ اس کا پرانا دردِ سر میگرین واپس آگیا ہے۔ دو دن تک وہ گھر سے نہ نکل سکی، اور نہ کسی کو اس کی بیماری کی خبر ملی۔ تیسرے دن جب اس کے سر کا درد تو ختم ہوگیا تھا لیکن کمزوری سے بالکل نڈھال ہوکر تقریباً اندھیرے میں لیٹی ہوئی تھی، اس نے دروازے کی گھنٹی کی آواز سنی۔ اس کے بعد کسی نے اس کا دروازہ کھٹکھٹایا اور اندر آنے کی اجازت لے کر رنجیت داخل ہوگئے۔

''مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ کی طبیعت خراب تھی۔ کسی سے کہہ کر فون تو کروادیا ہوتا،'' وہ پلنگ کے پاس رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔ ''آپ کی لینڈ لیڈی کہہ رہی تھیں کہ آپ کو میگرین ہوگیا تھا۔''

وہ بولی، ''ہاں! لیکن خبر دینے سے کوئی فائدہ نہ تھا۔ جوائس نے فون کرکے ڈاکٹر کو بلا دیا تھا۔ مجھے صرف خاموشی اور آرام کی ضرورت تھی۔ آپ کو خواہ مخواہ پریشان کیا کرتی!''

''خیر، اب بتایئے میں کیا کرسکتا ہوں۔ چائے پئیں گی؟''

''ہاں، آپ اپنے لیے بھی بنالیجیے۔'' چائے پینے کے لیے وہ پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گئی اور آہستہ آہستہ ان سے باتیں کرتی رہی۔ اسے معلوم بھی نہیں ہوا، لیکن نہ جانے کس بات پر یا کس کو یاد کرکے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ آنسوؤں کا جو باندھ ٹوٹ گیا تھا، اسے روک سکتی۔ اسے روتے دیکھ کر رنجیت کرسی سے اٹھ کر اس کے پاس آکر بیٹھ گئے۔ پھر اس کا سر ان کے شانے پر تھا اور اس کے آنسو ان کی جاکٹ میں جذب ہوتے رہے۔ آہستہ آہستہ ان کے لب ایک دوسرے کے لبوں سے مل گئے۔ اس لمس میں کیسا نشہ تھا۔ اسی نشہ میں وہ بہہ گئے تھے۔ ان کے بوسے

اس کے چہرے، اس کی آنکھوں اس کے ہونٹوں کو پھولوں کی نرم نرم بارش کی طرح چھو رہے تھے۔ ان دونوں کو معلوم نہیں ہوا وہ کتنی دیر تک ایک دوسرے کی قربت کے نشے میں سرشار رہے۔ جب ہوش آیا تو اندھیرا ہو چکا تھا۔

رنجیت اس سے الگ ہو کر بیٹھ گئے، جیسے ایک خواب سے جاگے ہوں۔ پھر آہستہ سے انھوں نے کہا، ''اب میں جا رہا ہوں۔ کالج میں خبر دے دوں گا کہ آپ بیمار ہیں۔''

ان کے جانے کے بعد اس نے سوچا یہ آج کیا ہو گیا۔ یہ کیسی کشش تھی کہ ہم دونوں ہی اس کے طوفان میں بہہ گئے۔ لیکن اسے اپنے اوپر تعجب ہو رہا تھا۔ اس کے خواب و خیال میں بھی یہ نہیں تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے اس قدر قریب آ جائیں گے۔ پھر اسے دیپک کے الفاظ یاد آئے: ''نہ میں سنیاسی ہوں اور نہ تم سے اس کی توقع کرتا ہوں۔'' اس نے سوچا اس وقت دیپک کیا کر رہے ہوں گے؟ کہاں ہوں گے؟ کیا سوچ رہے ہوں گے؟

کافی رات گزر چکی تھی۔ میگرین کے دورے کے بعد وہ بڑی کمزور ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ وہ پلنگ پر لیٹ کر سو گئی۔

دوسرے دن جب آنکھ کھلی تو دن نکل آیا تھا۔ وہ نہانے کے بعد ناشتہ کر کے کالج چلی گئی۔ کئی دن کی غیر حاضری کی وجہ سے کام کا جو نقصان ہوا تھا، اسے پورا کرنا چاہتی تھی۔ سب سے آخر کا لیکچر رنجیت کا تھا۔ وہ بھی گئی لیکن اسے محسوس ہوا کہ وہ اس سے آنکھیں بچا رہے ہیں۔ لیکچر کے بعد وہ جلدی سے کمرے کے باہر نکل گئے۔ نہ اس سے بات کی اور نہ کسی اور طالب علم سے۔ یہ سلسلہ کئی دن جاری رہا۔ اس نے مناسب نہ سمجھا کہ وہ انہیں روک کر ان سے باتیں کرنے کی کوشش کرے۔ ایک دن وہ لیکچر روم سے باہر نکل رہی تھی، اس نے دو لڑکیوں کو باتیں کرتے سنا۔

''تم نے غور کیا، آج کل رنجیت راج کا بالکل نوٹس نہیں لیتے۔''

دوسری نے جواب دیا، ''ہاں ذرا اکھڑے اکھڑے معلوم ہوتے ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے، کیا وجہ ہے؟''

پہلی لڑکی بولی، ''Lovers' quarrel'' پھر دونوں ہنستی ہوئی دور نکل گئیں اور وہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی۔

لیکن دوسرے دن سنیچر کو کافی صبح صبح وہ رنجیت کے گھر گئی۔ گھنٹی کی آواز سن کر جب انھوں نے

آ کر دروازہ کھولا تو اسے دیکھ کر وہ گھبرا سے گئے۔ ان کے بیٹھنے کے کمرے میں جاتے ہی اس نے ان سے سوال کیا تھا، ''آپ کرنا کیا چاہتے ہیں؟ میری بدنامی؟'' انھوں نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے کہا تھا، ''آپ میرے شوہر کے بڑے عزیز دوست ہیں۔ جس طرح آپ آج کل مجھے ignore کر رہے ہیں، اس سے لوگ یہی نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ہم دونوں میں لڑائی ہوئی ہے۔''

''کوئی ضروری نہیں ہے۔ یہ لوگ ہمارے تمہارے ملک والوں کی طرح دوسروں کے جھگڑوں میں نہیں پڑتے،'' انھوں نے کہا تھا۔

اس نے ناراض ہو کر جواب دیا تھا، ''غلط بالکل غلط! میں نے خود لڑکیوں کو کہتے سنا ہے کہ ان میں لڑائی ہے۔ Lovers' quarrel انسانی رشتوں میں دلچسپی لینا ہمارے یہاں ہی محدود نہیں ہے۔ ایک سال اس ملک میں رہ کر میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ ہماری نسبت یہ کتنے ہی فراخ دل سہی، لیکن انسان کی فطرت ہر جگہ ایک ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ آپ یہ بتایئے، آپ مجھے اس طرح کیوں ignore کر رہے ہیں؟''

''میں آپ کو ignore نہیں کر رہا ہوں۔ مجھے آپ سے شرمندگی ہے،'' انھوں نے جواب دیا۔

''کیوں؟'' اس نے سب کچھ جانتے ہوئے بھی ان سے سوال کیا تھا۔

''آپ میرے بڑے عزیز دوست کی بیوی ہیں اور میں ایسی ذلیل حرکت کر بیٹھا۔'' اس نے غصہ سے جواب دیا،

''میں دیپک کی بیوی ہوں لیکن اس کی ملکیت نہیں۔ اور نہ آپ کو شرمندگی کی ضرورت ہے۔ میں اکیلی تھی، دکھی تھی۔ آپ ذرا میرے قریب آ گئے تو کوئی قیامت نہیں آ گئی۔ لیکن اگر آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کے قریب آنے سے میرے دل میں میرے شوہر میرے بچوں کی محبت میں کمی آ گئی ہے تو آپ کا خیال غلط ہے۔ ہمارا رشتہ بڑی مستحکم بنیاد پر ہے۔ میرے دل میں اتنی جگہ ہے کہ ایک چھوٹا سا کونا آپ کو بھی دے سکتی ہوں۔''

انھوں نے کہا تھا، ''لیکن راج، اگر دیپک کو معلوم ہو گیا تو اسے کتنا دکھ ہوگا۔ کتنا غصہ آئے مجھ پر۔''

''ہاں۔ لیکن آپ نے کبھی سوچا ہے کہ دیپک کتنے طویل عرصے کے لیے نوکری کے سلسلے میں

باہر چلے جاتے ہیں۔ کیا وہ کبھی بھی کسی کے قریب نہیں گئے ہوں گے، چاہے چند لمحوں کے لیے ہی سہی؟ نہ انھوں نے مجھے ہر منٹ کی رپورٹ دی ہے اور نہ میں نے مانگی۔ لیکن وہ مرد ہیں۔ ان میں بڑی کشش ہے۔ میں صرف یہ جانتی ہوں کہ چاہے وہ کتنے ہی دن بعد واپس آئیں، گھر آ کر انہیں کتنی خوشی ہوتی ہے۔ انہیں مجھ سے کتنی محبت ہے۔''

رنجیت نے اسے بڑے تعجب سے دیکھا تھا، اور اس نے کہا تھا، ''آپ نے بہت دن سے ہندوستان چھوڑ دیا ہے اس لیے آپ کے ذہن میں وہاں کی وہی تصویر ہے جو آپ اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ لیکن ہمارا دیس بہت بدل گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہم بھی بدل رہے ہیں۔ بنیادی طور پر انسانی رشتے نہ یہاں بدلے ہیں نہ وہاں۔ لیکن ان لوگوں میں جنگ کے بعد کتنی تبدیلی آئی ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس درمیان میں ہم بالکل نہیں بدلے ہیں؟ ملک میں اتنا بڑا انقلاب آ گیا۔ وہ تین ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا اور ہماری اخلاقی قدریں ویسی کی ویسی ہیں؟''

رنجیت سر جھکائے ہوئے اس کی باتیں سنتے رہے۔ پھر بولے، ''تم ٹھیک کہتی ہو۔ ہندوستان کی جو تصویر میں اپنے ذہن میں لے کر آیا تھا، وہ اب تک بدلی نہیں ہے۔ مجھے یہ خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ تم جیسی عورتیں بھی وہاں ہیں۔''

اس نے جھنجھلا کر جواب دیا تھا، ''میں کوئی انوکھی عورت نہیں ہوں۔ میرے طبقے کی اور بھی عورتیں ہیں جو میری ہم خیال ہیں، لیکن ہم اپنے خیالات کا پرچار نہیں کرتے پھرتے۔''

''تو میں کیا کروں؟'' انھوں نے بڑی معصومیت سے پوچھا تھا۔

''کچھ بھی نہیں،'' اس نے جواب دیا تھا۔ ''جس طرح آپ مجھ سے برتاؤ کرتے تھے ویسے ہی کیجیے۔'' پھر رنجیت کے قریب آ کر اس نے آہستہ سے کہا تھا، ''آپ سے دوستی کی اہمیت میرے لیے بہت ہے۔ میں آپ کی عزت کرتی ہوں۔ آپ میں کشش محسوس کرتی ہوں۔ اس لیے بھی کہ آپ میں ایسی بہت سی باتیں ہیں جو میرے دیپک میں بھی ہیں۔ میں یہ نہیں سمجھتی کہ دو لمحے کے لیے آپ کے قریب آ کر میں نے کوئی گناہ کیا ہے۔''

تھوڑی دیر بعد وہ اپنے گھر واپس چلی گئی تھی۔ اس کے بعد ان کی دوستی ایک ہموار لیکن خوشگوار راستے سے گزری تھی۔ امتحان قریب تر آتا جا رہا تھا۔ وہ بہت مصروف تھی۔ وہ کبھی کبھی چند طالب علموں کے ساتھ یا رنجیت کے ساتھ تفریح کے لیے نکل جاتی۔

وہ دن اس کے لیے بہت قیمتی تھے۔ دیپک اور بچوں کی یاد اس کے دل میں تر و تازہ تھی، لیکن ساری ذمہ داریوں سے ہٹ کر وہ صرف اپنے دل و دماغ اور اپنی شخصیت کے لیے سرمایہ جمع کر رہی تھی۔ طالب علموں کی بحثیں، لیکچر، نئی نئی کتابیں تازہ ہوا کی طرح تھیں جنھوں نے اس کے دل و دماغ کو دوبارہ جگا دیا تھا اور ان دنوں کا وہ سرمایہ اب بھی اس کے پاس محفوظ تھا۔ اس کی اپنی بھی دنیا تھی۔ وہ صرف شوہر اور بچوں کے سہارے نہیں جی رہی تھی۔ اس کی شخصیت کی نشو و نما میں صرف اس کی کوششیں شامل نہیں تھیں۔ دیپک نے بھی اس کی مدد کی تھی، اور بچوں سے چھوٹ کر جب وہ جدائی کے غم کے بوجھ سے دبی جا رہی تھی تو رنجیت نے چند لمحوں کے لیے پناہ دے کر اس کی نسائیت اور اس کے وقار کو جگا دیا تھا۔ ان کی یاد بھی کتنی خوش گوار تھی۔

اپنی دل کش یادوں میں محو وہ خاموش بیٹھی رہی۔ اسے معلوم بھی نہیں ہوا کہ باہر باغ میں رات کا دھندلکا صبح کی روشنی میں تبدیل ہو چکا تھا۔

نوکر نے چائے کی کشتی اس کے سامنے رکھ دی۔ اس دن اسے کالج نہیں جانا تھا۔ شام کو دیپک بھی واپس آ رہے تھے۔ وہ چائے پی کر خانہ داری کے کاموں اور شوہر کی آمد کی تیاری میں مصروف ہوگئی۔ کئی دن سے اس کے دل پر جو ایک کیفیت طاری تھی وہ اب بدل گئی تھی۔ لیکن اب بھی کسی دوست یا عزیز کے پاس جا کر تفریح کرنے کی خواہش اسے نہیں تھی۔ فون پر اس کی ایک عزیز دوست نے لنچ پر مدعو کیا، لیکن اس نے بہانہ کر کے منع کر دیا۔ اس نے اپنے بیٹوں کو خط لکھے، اپنے والد کو فون کیا اور پھر سارا دن ایک رسالے کے لیے نفسیات پر ایک مضمون لکھتی رہی۔ شام کو نہا کر اور کپڑے بدل کر وہ دیپک کا انتظار کرنے لگی۔ انھوں نے اسے سویڈن سے فون کیا تھا کہ وہ لندن بھی جا رہے ہیں۔ انہیں وہاں ہندوستانی سفارت خانے میں کوئی کام تھا۔ زیادہ وضاحت سے وہ فون پر باتیں نہیں کر سکے تھے۔ آج ان کا جہاز دیر سے آ رہا تھا اور وہ بے چینی سے ان کا انتظار کر رہی تھی۔ تقریباً نو بجے اس نے کار کی آواز سنی۔ وہ باہر نکل آئی۔ دیپک سفر سے تھکے ہوئے تھے لیکن اسے دیکھتے ہی ان کی تھکن دور ہوگئی۔

نوکر سامان رکھ کر کمرے سے باہر چلا گیا تو وہ ان سے لپٹ گئی۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا، ''مجھے Miss کیا تھا؟'' دیپک نے شرارت سے مسکرا کر جواب دیا، ''بالکل نہیں!'' اور وہ دونوں ہنس پڑے۔

رات کا کھانا کھا کر دیپک نے اپنا بریف کیس کھول کر مسکراتے ہوئے اسے ایک تصویر دی۔ اس نے سرورق پلٹ کر دیکھا، رنجیت اور ان کے ساتھ ایک عورت تھی۔ وہ دونوں مسکرا رہے تھے۔ وہ تعجب سے بولی، ''یہ کون ہے؟''

''ان کی بیوی۔ چند ہفتے ہوئے ان دونوں کی شادی ہوگئی ہے۔ رنجیت بہت خوش ہیں۔ ہم دونوں تمہاری بھی باتیں کرتے رہے۔ ان کے دل میں تمہاری ذہانت اور شخصیت کی بڑی عزت ہے۔ میں نے لندن جا کر فون کیا تھا۔ کالج میں تھے۔ بڑے اصرار سے اپنے گھر بلایا۔ بڑی خوشی ہوئی انہیں دیکھ کر۔ یہ تصویر انھوں نے خاص طور پر تمہارے لیے بھیجی ہے۔ دیکھو کیا لکھا ہے۔''

اس نے دیکھا۔ لکھا تھا:

To Raj and Deepakwith best wishes
Cathy

اس کے نیچے لکھا تھا

To, my dear friends who taught
me how to love, Ranjit

خوش قسمت مریم

''مریم ایسی خوش قسمت ہوگی اس کا خیال تو ہمیں خواب میں بھی نہیں آیا تھا۔'' اماں نے یہ جملہ بار بار دہرایا تھا۔ ان کا سارا خاندان مریم کی شادی کے موقعے پر جمع تھا اور وہ نہال ہوئی جا رہی تھیں۔

''ارے آپا، میں نے اللہ کے حضور میں گڑگڑا کر دعائیں مانگیں۔ بس اس نے میری سن لی۔ میں اس کی رحمت کے قربان جاؤں،'' وہ آنسو پونچھ کر اپنی بہن سے کہہ رہی تھیں۔

''اس کا رنگ ذرا میلا ہے نا اور ہمارے پاس بھی جہیز میں دینے کو لاکھوں نہیں اسی لیے دیر ہوگئی،'' انھوں نے رازداری سے کہا۔

مریم بھی بے حد خوش تھی۔ ہسٹری میں ایم اے کرنے کے بعد عرصہ تک گھر بیٹھی رہی، پھر خدا خدا کر کے نوکری ملی۔ ساری دوستوں کی شادیاں ہوگئی۔ امیر غریب، خوبصورت بدصورت، کچھ بھی ہو ان کا اپنا شوہر تو تھا۔ ساس سے بنے یا نہ بنے۔ شوہر دوسری بیوی ہی کیوں نہ لے آئے، گھر تو ان کا تھا۔ رہ گیا طلاق تو یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ہمیشہ ہی ہوتا آیا ہے۔ اور پھر زمانہ ہی بدل گیا۔ جو طلاق شدہ تھیں وہ بھی اپنے گھروں میں کنواری نہیں بیٹھی تھیں۔

مریم نے اپنی زندگی پاک دامنی سے گزاری تھی۔ بقول اماں کے اس نے کسی مرد کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ شادی کے وقت حضرت مریم کی طرح پاک اور کنواری تھی۔ لیکن صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ اب اسے اپنے جوڑ کا شوہر ملا تھا۔ جسے مریم کی نہ جانے کون سی ادا پسند آئی تھی کہ اتنی لڑکیوں میں اس نے مریم کو ہی پسند کیا۔ اس کی ماں کو تعجب بھی ہوا تھا۔ منصور دنیا کے سب سے امیر ملک امریکہ سے آیا تھا جہاں وہ یونیورسٹی کی تعلیم ختم کرتے ہی وظیفہ لے کر چلا گیا تھا۔ وہیں اسے اکاؤنٹینسی کی تعلیم ختم کرنے کے بعد بڑی اچھی نوکری مل گئی تھی اور پھر وہ تیزی سے ترقی کرتا ہی گیا۔

امریکیوں پر نسلی تعصب، مادیت پرستی اور جذباتی ہونے کے الزامات صحیح بھی ہوں لیکن اس میں شبہ نہیں وہ ذہانت اور محنت اور تعلیم کی قدر جانتے ہیں اور کم از کم برصغیر سے آنے والوں کو وہاں ترقی کے امکانات حاصل ہوئے تھے۔ منصور نے جی جان لگا کر کام کیا تھا بلکہ کام ہی اس کی زندگی بن گیا

تھا۔ شہروں شہروں اور پھر ملکوں ملکوں، جہاں اس کی کمپنی کی شاخیں تھی دورے پر جانا، ہفتوں گھر سے غائب رہنا، یہ سب اس کی زندگی کا معمول بن گیا تھا۔ اور گھر میں ہی کیا رکھا تھا جو اسے وہاں جم کر رہنے کی خواہش ہوتی۔ اس سے تو اچھے ہوٹل ہی تھے جہاں ہر طرح آسائش اور تفریحات چٹکی بجاتے ہی حاصل ہوجاتی تھیں۔ اس کا خاندان چھوٹا سا تھا۔ والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ ایک امریکن لڑکی سے شادی کرلی تھی، لیکن وہ زیادہ دن چلی نہیں۔ جلد ہی طلاق ہوگئی اور اب وہ کافی عرصے کے بعد دوست احباب اور رشتہ داروں سے ملنے آیا تھا۔ یہاں شادی کی بات اٹھی تھی اور دراز قد کی سانولی سلونی بڑی بڑی آنکھوں والی مریم اسے بھاگئی۔ شادی کے بعد وہ امریکہ واپس چلے گئے جہاں شاندار گھر، دو دو گاڑیاں اور سارے آرام و آسائش ان کا انتظار کر رہے تھے۔

مریم نے سوچا تھا وہ اماں، سارے خاندان اور دوستوں کے چھٹنے کا غم نئے ملک کی مصروفیتوں اور شوہر کی محبت میں اتنی شدت سے محسوس نہیں کرے گی۔ وہی ہوا بھی، لیکن عرصہ گزر گیا اس کے من کا کنول کھلا نہیں۔ اس کی گود اب بھی خالی تھی، کیونکہ منصور نے کہا تھا انہیں بچے کی جلدی نہیں اور اس کے لیے سارا انتظام انھوں نے ہی کیا تھا۔ مریم کو محسوس ہوا جیسے ان دونوں کو کسی کی نظر لگ گئی ہے۔ اس کا خوشرو شوہر دن بدن دبلا ہونے لگا۔ سر کے بال تیزی سے گرنے لگے۔ جسم پر جگہ جگہ دھبے پڑ گئے، جنہیں خاص قسم کے میک اپ سے اس نے اوروں کی نظر سے چھپانا چاہا لیکن مریم کی آنکھوں سے کیسے چھپا سکتا تھا جو جانتی تھی کہ اس کی ساری پشت دانوں سے بھری ہوئی ہے اور ایک دم بیٹھے بیٹھے غسل خانے جاکر وہ خون تھوکتا ہے۔ ٹیسٹ پر ٹیسٹ ہورہے تھے۔ مریم نے ڈاکٹروں سے بار بار پوچھا، ''کیا مرض ہے انہیں؟'' لیکن انھوں نے کوئی تسلّی بخش جواب نہیں دیا۔ اس نے بھی اپنی ماں کی طرح گڑگڑا کر دعائیں مانگیں لیکن وہ قبول نہیں ہوئیں۔ شاید وہ راتوں کی نمازوں اور وظیفوں یا شوہر کی فکر کا اثر تھا کہ اب وہ بھی دبلی ہوتی جارہی تھی۔ اس کے چہرے سے جوانی کی رونق غائب ہوگئی تھی اور جگہ جگہ کالے دھبے پڑ گئے تھے۔ اس کے کالے کالے گھنگرالے بال گر رہے تھے۔ وہ اکیلی بھی ہوگئی تھی کیونکہ اس کے شوہر کو کچھ عرصہ سے ہسپتال میں داخل کرلیا گیا تھا۔

اس دن وہ ان سے ہی ملنے ہسپتال گئی تھی۔ آج اس نے غور سے ان مریضوں کو دیکھا تھا جو اسی وارڈ میں تھے۔ تقریباً سب ہی جوان تھے، لیکن ان کے چہرے دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ جوانی اب ان سے کوسوں دور تھی۔ ان میں وہ بھی تھے جو زندگی میں ہی موت قبول کر چکے تھے اور بعض آخر دم

تک زندگی کے ہر ہر لمحے کو خندہ پیشانی سے رخصت کرنے کا عزم رکھتے تھے۔ اس نے سوچا، ''اس برادری میں میری جگہ کہاں ہے؟''

مریم حسب معمول اپنے شوہر سے مسکرا کر ملی لیکن وہ اداس اداس اور خاموش اس کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر آہستہ سے بولے، ''مریم شاید تم کو بھی وہی لاعلاج مرض ہوگیا ہے جو مجھے ہے۔''

''ہاں، ڈاکٹروں کا بھی یہی خیال ہے۔ ٹیسٹ ختم ہوجائیں تو مجھے بھی اسی ہسپتال بلکہ اسی وارڈ میں داخلہ مل جائے گا۔ اور ہم دونوں اب ایک ساتھ ہی رہیں گے۔ کیسی خوش قسمت ہوں میں!'' اس کے چہرے پر تلخ مسکراہٹ اور آنکھوں میں آنسو تھے۔

پُرانا گھر نئے باسی

عابدہ کی ٹیکسی اس پرانے اور تاریخی شہر کے پر ہجوم گلی کوچوں سے گزرتی ہوئی آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔ اس وقت تقریباً سات بج رہے تھے۔ چراغ جل گئے تھے۔ سڑکوں پر شام کی رونق اور گہما گہمی تھی، لیکن اسے باہر کے منظر میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ بہت تھک گئی تھی۔ امریکہ سے ہندوستان کے سفر نے اس کے اعضا کو چور چور کر دیا تھا، اور اس میں اس کا ہی قصور تھا۔ اس کے شوہر اور بیٹیوں نے لندن رک کر آرام سے سفر کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ اس کے شوہر کو کسی کانفرنس میں شرکت کرنا تھی، انہیں تو رکنا ہی تھا، لیکن ان کی بیٹیاں بھی ان کے ہی ساتھ رک گئی تھیں۔ انہیں لکھنؤ آنے کی جلدی نہیں تھی۔ وہ جب چھوٹی چھوٹی تھیں تو امریکہ چلی گئی تھیں۔ وہ اب رنگ ونسل کے لحاظ سے تو ہندوستانی تھیں، لیکن زبان، کلچر اور خیالات کے اعتبار سے ان میں اور امریکن لڑکیوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اور اس میں ان کا قصور بھی نہیں تھا۔ چند دن تک ماں باپ نے کوشش کی کہ بچیاں ان سے اپنی ہی زبان بولیں۔ مگر پھر استانیوں نے رائے دی کہ گھر پر بھی بچیوں سے انگریزی بولی جائے، ورنہ دو دو زبانیں ان پر بار ہو جائیں گی اور آئندہ ان کی ترقی میں حائل ہوں گی۔

عابدہ اور اس کے شوہر عرفان نے یہ رائے بغیر کسی حیل وحجت کے منظور کر لی۔ بلکہ یوں کہیے کہ اپنی زبان سکھانے کی جو ذمہ داری ان پر تھی، اس کا بار بھی اٹھ گیا۔ ویسے بھی ایک نئے ملک اور غیر مانوس معاشرے کو اپنانے کے لیے کتنے مرحلے ہوتے ہیں، وہی کیا کم تھے۔ اور دونوں لڑکیوں نے ماشاء اللہ بڑی ترقی کی تھی۔ بڑی بیٹی زہرا نے فرانسیسی، ہسپانوی اور اطالوی زبانوں میں یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کی تھی اور اب اقوامِ متحدہ میں ترجمان کا کام کر رہی تھی۔ چھوٹی بیٹی عذرا میجر کر رہی تھی۔ بچپن میں جو زمانہ ہندوستان میں گزارا تھا، اس کی یادیں اب دھندلا گئی تھیں۔ ہاں، عید کی بڑی شان دار پارٹی ان کے ہاں ہوتی تھی۔ زہرا اور عذرا کی امریکن سہیلیاں آتیں۔ زہرا اور عذرا غرارہ اور کرتا پہنتیں، جو ہر سال نانی اماں عابدہ کے منع کرنے پر بھی

دونوں نواسیوں کے لیے بھیجتیں اور پھر غرارہ اور کرتا تہہ کر کے رکھ دیا جاتا۔ نانی اماں سے بھی ان کا رشتہ کچھ اسی قسم کا تھا۔ پانچ چھ سال بعد جب ہندوستان آتیں تو ''تسلیمات نانی اماں''، ''آداب عرض خالہ جان'' وغیرہ کے بعد اردو ختم ہو جاتی۔ اور عابدہ کی ماں بڑی نرمی سے بیٹی سے شکایت کرتیں، ''اے عابدہ، بچیوں کو اپنی زبان کے دو لفظ بھی نہیں سکھائے جو میں اپنی نواسیوں سے ذرا دل کھول کر باتیں کر سکوں۔'' پھر نواسیوں سے کہتیں، ''ذرا آہستہ آہستہ بولو۔ میں انگریزی جانتی ہوں لیکن یہ امریکن انگلش سیکھنے میں وقت لگے گا۔'' خیر جب لال پیارے تو ان کے کھیل بھی پیارے۔ ان کی زبان بھی پیاری۔ کسی نہ کسی طرح ٹوٹی پھوٹی اردو اور زنگ آلود انگریزی میں نانی اور نواسیاں اپنا مطلب نکال لیتیں۔ لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے یہ رشتہ مستحکم نہ ہونے پاتا۔

عابدہ کو بیوہ ماں، بھائی بہن اور رشتہ داروں کی محبت کے علاوہ جوانی کی رومان انگیز یادیں بھی لکھنؤ کھینچ لاتیں۔ اس کی بیٹیاں بھی ان مدھم یادوں کی چراغ کی لو کو بھڑکا دیتیں۔

''امّی، آپ اپنے دوستوں کے ساتھ یہاں کافی پینے آتی تھیں؟ ابا جان بھی آپ کے ساتھ آتے تھے؟''

اس کی چھوٹی بیٹی عذرا نے یہ سوال پھر دہرایا۔ خریداری کے بعد وہ کافی ہاؤس میں بیٹھی تھیں۔ عذرا بھی چھوٹی تھی اور بار بار سمجھانے کے باوجود امریکی اور ہندوستانی معاشرے کے فرق کی گہرائیوں کو نہیں سمجھ پا رہی تھیں۔

عابدہ نے مسکرا کر کہا، ''نہیں، تمہارے ابا جان یہاں مجھ سے بات بھی مشکل سے کر پاتے تھے۔ ساتھ آنا تو بہت بڑی بات تھی۔''

''کیوں، اس میں کیا برائی تھی؟ آپ تو پردہ بھی نہیں کرتی تھیں۔ لڑکوں کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی تھیں۔''

''اوّل تو تمہارے ابا لیکچرر تھے اور یونیورسٹی کے استاد لڑکیوں کے ساتھ کافی ہاؤس میں بیٹھ کر کافی نہیں پیا کرتے تھے۔ یہ مغربی اور مشرقی تہذیب کا فرق ہے، جو اب بھی ہے اور بہت دن رہے گا۔''

"Oh I see" عذرا نے بڑی متانت سے کہا۔ پھر بولی ''اور کون کون آتا تھا کافی ہاؤس

میں؟ کیا سب پروفیسر یہیں آتے تھے؟''

''ہاں پروفیسر ڈی پی جوہری صاحب، حلیم صاحب، احتشام صاحب، سبھی آتے تھے۔ کتنوں کے نام گناؤں۔ لکھنؤ کے طلبا پر ان لوگوں نے کیسا اثر چھوڑا ہے، اس کا اندازہ تم تو کیا، ہم بھی نہیں کر سکتے۔''

''کیا وہ سب ابا جان کی طرح ہینڈسم تھے؟'' عذرا نے پوچھا۔ اس زمانے میں اس کے لیے یہ سوالات بڑے اہم ہو گئے تھے۔

''نہیں، ان میں سے کوئی رابرٹ ریڈفرڈ نہیں تھا،'' عابدہ نے ہنس کر کہا۔ ''لیکن ان سب میں بڑی کشش تھی، جو ان کے علم، ان کے خیالات، ان کے ارادوں کے استحکام کی وجہ سے تھی۔ میں کبھی کبھی سوچتی ہوں اگر وہ لوگ زندہ ہوتے اور ہم دونوں ان سے ملنے جاتے تو وہ کیا کہتے؟'' اس نے خود ہی سے یہ سوال کیا اور اس کے چہرے پر ایک غبار سا آ گیا۔

''کیا وہ آپ کو اور ابا جان کو لکھنؤ اور ہندوستان چھوڑنے کے لیے ڈانٹتے؟'' عذرا نے گھبرا کر پوچھا۔

عابدہ ہنس پڑی۔ ''شاید ڈی پی صاحب ڈانٹ دیتے۔ لیکن احتشام صاحب بڑی محبت سے ملتے۔ چائے پلاتے اور پھر آہستہ سے کہتے: ہم سب کو تم دونوں سے کافی توقعات تھیں کہ تم اپنے وطن اور اپنے سماج کے لیے کچھ کرو گے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہتے۔''

ٹیکسی کو دھکا لگا اور عابدہ کی آنکھیں کھل گئیں۔ اب وہ گھر کے قریب آ گئی تھی اور سڑک پر گڈھے کچھ اور بڑھ گئے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ ٹیکسی سے اتر کر پھاٹک میں داخل ہوئی۔ دیکھا کہ فیض علی ہل ہل کر وظیفہ پڑھ رہے ہیں۔ اس کے جوتوں کی آواز سن کر انھوں نے اس کی طرف مڑ کر دیکھا اور وظیفے کے الفاظ ان کے زبان پر رک گئے۔

''آداب عرض، فیض علی چچا،'' اس نے ذرا جھک کر کہا اور فیض علی کے نورانی چہرے پر نظر ڈالی۔ پانچ سال بعد ان کی فرنچ داڑھی اور بھی سفید ہو گئی تھی۔ چہرہ کچھ اور ست گیا تھا۔ ان کے پٹے دار سفید بالوں اور چکن کی دوپلی ٹوپی نے ان کے چہرے کے چاروں طرف نور کا ایک ہالا سا بنا دیا تھا۔

عابدہ کو دیکھ کر ان کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی اور ساتھ ہی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر ان کی داڑھی میں گم ہو گئے۔

''ارے بٹیا، تم اکیلی ہی آئی ہو اتنی دور سے؟ ہم تو اگلے جمعے کو تمہارے آنے کی امید کر رہے تھے۔'' پھر سنبھل کر بولے۔ ''جیتی رہو۔ جیتی رہو۔ خوش و آباد رہو۔ تم آگئیں۔ بس ہماری عید ہوگئی۔ یہ سمجھو عید کا چاند توقع سے پہلے ہی دیکھ لیا۔'' پھر چیخ چیخ کر نوکروں کو آوازیں دینے لگے۔

عابدہ جلدی سے دھڑکتے ہوئے دل کو سنبھالے گھر کے اندر داخل ہوگئی۔

برآمدے میں تخت پر بیٹھی ہوئی اس کی ماں زاہدہ بیگم قرآن شریف پڑھ رہی تھیں۔ انھوں نے اس کی طرف نظر کی۔ قرآن شریف کو بوسہ دے کر بند کیا۔ پھر ان کے ضبط کا باندھ ٹوٹ گیا۔ عابدہ نے ان کی گود میں اپنا سر رکھ دیا اور دونوں ماں بیٹی ایک دوسرے سے لپٹ کر رو دیں۔

کچھ دیر بعد دونوں نے ضبط کیا۔ آنسو پونچھے۔ پھر زاہدہ بیگم بولیں:

''ارے بچیاں کہاں ہیں؟ عرفان میاں کہاں ہیں؟ ہم تو اگلے جمعے کو تمہارے آنے کی امید کر رہے تھے۔''

عابدہ نے کہا، ''وہ سب ابھی تک لندن میں ہیں۔ عرفان کو ایک کانفرنس میں شرکت کرنا تھی۔ بچیاں بھی ان کے ہی ساتھ رہ گئیں۔ لیکن لندن آکر مجھ سے صبر نہیں ہوا کہ اور انتظار کروں، اس لیے میں اکیلی ہی آگئی۔ خبر اس لیے نہیں دی کہ آپ لوگوں کو پریشانی ہوگی۔ میں نے ساری دنیا کا سفر کیا ہے۔ اسٹیشن یا ایرپورٹ سے گھر تک آنا کون سا بڑا مرحلہ تھا۔''

زاہدہ بیگم بولیں، ''چلو تم خیریت سے آگئیں اور وقت سے پہلے ہی آگئیں۔ یہی میرے لیے نعمت ہے۔ جاؤ، اپنی خالہ کو سلام کر آؤ۔'' وہ جملہ بھی پورا نہیں کر سکی تھیں کہ ان کی بہن خود ہی آگئیں۔ ان سے بھی عابدہ کی ملاقات بڑی جذباتی تھی۔

بیوہ ہونے کے بعد زاہدہ بیگم اور ان کی بڑی بہن ایک ساتھ ہی رہنے لگی تھیں۔ اتنے بڑے گھر میں سوائے دو سن رسیدہ بہنوں کے اور کوئی نہیں تھا۔ ایک بیٹا تھا جو پاکستان میں کسی بڑے عہدے پر فائز تھا۔ ایک بیٹی ۔ بمبئی میں بیاہی تھی اور عابدہ شادی کے چند سال بعد امریکہ چلی گئی تھی اور وہیں کی شہریت اختیار کر لی تھی۔ فیض علی جو دور کے رشتہ دار بھی تھے، جائداد کی دیکھ بھال کرتے اور باہر کا سب کاروبار بھی ان کے دم سے چل رہا تھا۔ کسی کو بھی یہ سوچنے کی ہمت نہیں تھی کہ ان کے بعد کیا ہوگا اور ان سن رسیدہ خواتین کی دیکھ بھال کون کرے گا۔

عابدہ کی آمد سے تھوڑی دیر کے لیے گھر میں ہنگامہ سا ہوگیا۔ لیکن جب ذرا حواس ٹھکانے

آئے تو کھانے کے بعد دونوں ماں بیٹیاں بڑی دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ زاہدہ بیگم اپنے بیٹے، چھوٹی بیٹی، ان کے خاندان، قریب و دور کے رشتہ داروں کا ذکر کرتی رہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنے خاندانی نوکر کی یتیم بیٹی زینب کی بھی باتیں بار بار کرتی رہیں۔ عابدہ کو احساس ہوا کہ اب زینب نے نواسیوں اور پوتیوں کی جگہ ان کے دل میں لے لی ہے۔

تقریباً بارہ بجے جب وہ پلنگ پر لیٹی تو نیند اس سے کوسوں دور تھی۔ نہ جانے کتنی دیر تک وہ آنکھیں کھولے لیمپ کی ہلکی ہلکی روشنی میں چھت کو تکتی رہی اور پھر جو ہی کی بھینی بھینی خوشبو سے معطر ہوا کے جھونکوں نے اسے تھپک تھپک کر سلا دیا۔ جب اس کی آنکھ کھلی صبح ہو چکی تھی اور اس کے کمرے کی کھڑکی سے لگی ہوئی بیل پر دو چڑیاں کسی مسئلے پر بڑے جوش و خروش سے تبادلۂ خیالات کر رہی تھیں۔ وہ ہلکا سا ڈریسنگ گاؤن پہن کر باغ میں نکل گئی۔

اس کی آنکھیں تو کھلی ہوئی تھیں، لیکن اس کے دماغ اور ذہن پر ایک غبار سا چھایا ہوا تھا۔ نیویارک، لکھنؤ، صبح و شام، بچپن، جوانی اور درمیانی عمر کے ماہ و سال اس طرح الجھ کر رہ گئے تھے کہ وہ انہیں سلجھا نہیں پا رہی تھی۔ اس نے سوچا شاید اسی کو جیٹ لیگ کہتے ہیں، اور وہ آہستہ آہستہ بیلے اور موگرے کی معطر کیاریوں سے گزر کر باغ کے اس حصّے میں پہنچ گئی جہاں قلمی آموں کا کُنج تھا۔ اس نے سر اُٹھا کر کیریوں کی تلاش میں سبز اور چمکیلے پتوں پر نظر ڈالی اور پھر وہ اپنی حماقت پر خود ہی ہنس دی۔ آموں کا موسم تو کب کا ختم ہو چکا، اس نے خود کو یاد دلایا۔

ذرا اور آگے چل کر وہ کنویں کے پاس پہنچی۔ کنویں سے پانی نکل کر باغ کی پتلی پتلی نالیوں میں بہتا تھا، جن میں وہ اور اس کی چھوٹی بہن کشتیاں بنا کر چھوڑا کرتی تھیں۔ پھر اسے یاد آیا اسی کنویں کے پیچھے وہ عرفان سے کتنی بار ملی تھی۔ یہیں سب کی نظروں سے چھپ کر دونوں نے عہدِ وفا کیا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر بڑی پیاری سی مسکراہٹ آ گئی۔

ذرا اور آگے چل کر وہ گلاب کی کیاریوں کے پاس روش پر بیٹھ گئی۔ ''ابا جان کو گلابوں سے کیسا عشق تھا،'' اس نے آہستہ سے کہا۔ پھر اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ ابھی اپنے اس کمرے کے دروازے سے باہر آ جائیں گے جو باغ میں کھلتا ہے اور سیدھے اپنے محبوب گلابوں کی نگہداشت کے لیے یہیں آئیں گے اور اسے دیکھ کر کہیں گے، ''ارے تم یہاں کیسے؟ تم تو اگلے جمعے کو آنے والی تھیں۔'' پھر وہ باغبانی میں لگ جائیں گے اور وہ اسی روش پر بیٹھی بیٹھی ان سے باتیں کرتی رہے گی۔ عرفان کی، بچیوں

کی ایک نئے ملک میں رہنے کی جدّ وجہد کی اور اماں جان کی، جو دن بدن کمزور ہوتی جارہی تھیں۔ اور وہ ان سے شکایت کرے گی اپنے بھائی کی اور خود اپنی خود غرضیوں کی، تن آسانیوں کی اور بے وفائیوں کی۔

آہستہ آہستہ آنسو اس کے رخساروں کا فاصلہ طے کر کے مٹی میں جذب ہوتے رہے۔ اور وہ انتظار کرتی رہی کہ وہ کہیں، ''ارے تم روتی کیوں ہو؟ انشاء اللہ کوئی نہ کوئی راستہ نکالیں گے ہم۔'' لیکن وہ خاموش ہی رہے۔

ڈریسنگ گاؤن کے دامن سے آنسو پونچھ کر وہ گھر کی طرف چل دی۔ اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس کی کیاری میں اس کی نظریں نرگس کے ان پودوں کو ڈھونڈنے لگیں جو اس نے ابا جان سے فرمائش کر کے لگوائے تھے۔ اب ان کا نشان تک باقی نہیں تھا۔ ہاں پاس ہی جوہی کی بیل اور بڑھ گئی تھی اور پھولوں کے بوجھ سے جھکی جارہی تھی۔ پھولوں کی خوشبو اس کے حواس پر نشے کی طرح چھا گئی۔ چند لمحوں بعد جب اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو دور پورب میں سورج نکل آیا تھا اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی بے رحم روشنی نے اس طلسم کو چکنا چور کر دیا ہے جس نے ہر چیز کو چاندی بنا دیا تھا۔ ایک دفعہ اس نے باغ کو پھر دیکھا، جہاں بیلیں اور پیڑ من مانے انداز سے پھیلتے جارہے تھے اور اس کے کمرے کی کھڑکی کے نیچے سے شروع ہو کر ایک لمبی سی دراڑ مکان کی نیو میں گم ہو گئی تھی۔

تیزی سے چلتی ہوئی وہ اپنے کمرے میں آگئی۔ اور دن کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ اس کے خیر مقدم کے لیے نئی قلعی کی گئی ہے، لیکن وہ دیواروں کی بوسیدگی کو چھپا نہیں سکی۔ نہانے کے بعد وہ آئینے کے سامنے بیٹھ کر اپنے بال سکھا رہی تھی کہ پردہ اٹھا اور ایک تیرہ چودہ سال کی لڑکی اندر آئی اور اس سے لپٹ گئی۔ پھر شرارت بھری سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ عابدہ ہنس کر بولی:

''اری تو زینب ہے!'' اور پھر اسے لپٹا لیا۔ لڑکی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''میں جانتی تھی آپ مجھے پہچان جائیں گی۔ ابھی ابھی آئی تو نانی بیگم نے بتایا آپ آگئی ہیں۔ میں دوڑی دوڑی آپ کے پاس آگئی۔ لائیے آپ کے بال کاڑھ دوں۔''

عابدہ نے پوچھا، ''زینب! کیا تم یہیں رہو گی اماں جان کے پاس؟''

وہ بڑی سنجیدگی سے بولی، ''ہاں بی بی، وہاں گاؤں میں اردو نہیں پڑھائی جاتی، اس لیے نانی بیگم مجھے اپنے ہی پاس رکھ کر پڑھائیں گی۔ میرا داخلہ بھی ہو گیا ہے۔ میں سائنس پڑھوں گی۔'' پھر بڑے فخر سے بولی۔ ''میں اپنی کلاس میں فرسٹ آئی تھی۔''

وہ ہنس ہنس کر اپنی ماں، اپنے خاندان کا ذکر کرتی رہی۔

عابدہ نے سوال کیا، ''سائنس کیوں پڑھوگی؟''

اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ پھر آہستہ سے شرما کر بولی، ''میں انجینئر بنوں گی بی بی!''

چند ہی لمحوں میں زینب کے معصوم اور شگفتہ چہرے، اس کی محبت اور اس کے مستقبل کے روشن منصوبوں نے عابدہ کی افسردگی کو جادو کی طرح دور کردیا۔ وہ بھی اب زینب کی طرح مسکرا رہی تھی۔ پھر اس نے نظر اٹھا کر کھڑکی کی طرف دیکھا جہاں سورج کرنیں پتّیوں سے چھن چھن کر آرہی تھیں، لیکن ایک لمحے کے لیے اس کی نظریں دیواروں کی بوسیدگی سے الجھ گئیں۔ زینب نے اس کے چہرے کا عکس آئینے میں دیکھ کر آہستہ سے کہا، ''بیوی یہ گھر بہت پرانا ہوگیا ہے۔'' عابدہ نے اس کے شگفتہ چہرے کو نظر بھر کر دیکھا، پھر مسکرا کر بولی، ''ہاں، لیکن اب اس میں نئے باسی آئیں گے۔''

تلاش میں

ڈاکٹر راجندر کمار برسوں بعد گھر آئے تھے۔ ان کی بوڑھی ماں نرملا پر اب بڑھاپا آگیا تھا۔ ویسے بیچاری جوان ہی کب تھیں۔ چودہ برس کی تھیں کہ شادی ہوگئی۔ ایک سال بعد راجندر پیدا ہوئے اور اسی سال ان کے شوہر کامتا پرشاد غائب ہوگئے۔ کسی کو آج تک نہ معلوم ہوسکا کہ کہاں گئے۔ پولیس میں رپورٹ کی گئی۔ رشتہ داروں نے سارا شہر چھان مارا لیکن کہیں پتہ نہیں چلا۔ نہ ہی پولیس والوں نے خبر دی۔ آخر سب تھک ہار کر بیٹھ گئے، اور کرتے بھی کیا۔ معلوم تھا بہت دن سے دماغ میں سنک تھی۔ علاج سے کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ ڈاکٹروں اور دیدوں دونوں نے ہی کہا تھا کہ اگر شادی کردی جائے تو امکان ہے کہ دماغ ٹھیک ہوجائے گا، اسی لیے جلدی جلدی لڑکی تلاش کی گئی۔ کامتا پرشاد کی جو حالت تھی اس کی وجہ سے جہیز اور لگن کی بڑی رقم ملنے کا امکان بہت کم تھا اس لیے کامتا پرشاد کے ماں باپ نے بھگوان کا نام لے کر نرملا کے ساتھ بیاہ ٹھیک کردیا۔ لڑکی کا خاندان غریب سہی لیکن وہ لوگ ہی کون سے بڑے امیر تھے۔ لڑکی برادری کی تھی۔ شکل صورت کی پری نہ سہی لیکن آدمی کا بچّہ تھی۔ ہاں اتنی بات ضرور تھی کہ بڑی ذہین تھی۔ میٹرک میں پڑھ رہی تھی۔ اسکول کی فیس بھی معاف تھی اور وظیفہ بھی ملتا تھا جس سے خود اس کا ہی خرچ نہیں نکل آتا تھا بلکہ پانچ روپیہ مہینہ بھائی کی فیس کی مد بھی نکل آئی تھی۔ امتحان سے کچھ مہینے پہلے ہی منگنی ہوئی تھی اور نرملا کے باپ کی بس یہی شرط تھی کہ بیاہ کی لگن امتحان کے بعد ہی رکھی جائے۔ وہی ہوا۔ لڑکے اور لڑکی کی جنم پتری دیکھی گئی اور نرملا کے امتحان کے بعد کامتا پرشاد بہو گھر لے آئے۔ جب میٹرک کے امتحان کا نتیجہ نکلا تو معلوم ہوا نرملا نہ صرف فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوئی ہے بلکہ ضلع بھر میں اوّل آئی ہے۔ اگر آگے پڑھتی تو وظیفہ ملتا۔ لیکن اس خبر سے نہ کسی کو بڑی خوشی ہوئی اور نہ ہی اس سے کوئی فائدہ اٹھایا گیا۔ ہاں جب نرملا نے سنا تو اس کی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر اس آٹے میں گر گئے جو وہ روٹیوں کے لیے گوندھ رہی تھی۔ اس نے سوچا، ''ہائے بھگوان، کیسی ابھاگنی بنایا ہے مجھے۔ کامیابی بھی ہوئی تو اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتی۔ فرسٹ آؤں یا نہ آؤں، کون مجھے پڑھنے دے گا۔'' اور پھر اس نے فرسٹ آنے کا خیال ہی دل

سے نکال دینا چاہا۔ ہاں اسکول کے سالانہ جلسے کے موقعے پر اسے سونے کا تمغہ دیا گیا جو اس نے ساس کے ہاتھ میں لا کر رکھ دیا۔ دوسرے دن نرملا روٹیاں بنا رہی تھی۔ سسر چوکے میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ ساس ان پر پنکھا جھل رہی تھیں۔ انھوں نے کہا، ''بہو کو سونے کا تمگا ملا ہے۔''

''اچھا،'' وہ تعجب سے بولے، ''سچّے سونے کا ہے کیا؟''

ساس نے جواب دیا، ''اور نہیں تو کیا سرکار کیا جھوٹے سونے کا تمغہ دیگی؟''

سسر بولے، ''کہتی تو ٹھیک ہو،'' پھر ہنس کر بولے۔ ''بہو تمغا کا کیا کرے گی۔ کانن (کانوں) کے بندے بنوائے دیو۔ تمغا پہن کر تو بہو سادی بیاہ میں جائے گی نہیں۔'' پھر اپنی حماقت آمیز تجویز پر خود ہی ہنس دیے۔ تمغہ لوہے کے صندوق میں بند کر کے رکھ دیا گیا۔ کامتا پرشاد کو اپنی کامیابی یا سونے کے تمغے کی بات نہ نرملا نے بتائی اور نہ کسی اور نے۔ وہ اپنے ہوش و حواس میں ہی کب تھے۔ ان کی سنک اب دن پر دن بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک سال بھی نہیں ہوا تھا کہ نرملا کے یہاں لڑکا ہو گیا۔ چند مہینے بعد وہ غائب ہو گئے۔

گھر والوں نے سالوں انتظار میں گزار دیے۔ پھر امید ٹوٹ گئی۔ لیکن نرملا روز شو کی پوجا کرتی کیوں کہ سہاگنیں انہیں پوج کر ہی اپنے سہاگ کو امر کرنے کی پرارتھنا کرتی ہیں۔ پوجا کے بعد مانگ میں سیندور بھرنا اور شور اتری کا اُپاس (۱) اس کے لیے زندگی بھر قائم رہا۔ سوچتی تھی بھگوان جانے کہاں ہیں، کیسے ہیں۔ جب تک آنکھ سے نہ دیکھ لوں بدشگونی کیوں کروں۔ گھر والے بھی یہی چاہتے تھے۔ شوہر نے اسے کچھ اور دیا ہو یا نہیں لیکن ایک بیٹا اور ساری زندگی کے لیے سہاگ ضرور دے دیا۔ ساس سسر کو بیٹے کے غائب ہو جانے کا غم ہوا۔ پاگل سنکی جو بھی تھا، بیٹا تو تھا۔ اب دیکھتے دیکھتے اسے زمین نگل گئی یا آسمان نے اٹھا لیا کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ بہو سے بھی مایوسی ہوئی۔ وہ اچھا بھاگ لے کر نہیں آئی تھی۔ امید تھی کہ شادی کے بعد کامتا پرشاد ٹھیک ہو جائیں گے، لیکن وہ ہوا نہیں۔ ہاں چلتے چلتے اپنی نشانی کا ایک بیٹا چھوڑ گئے تھے۔

نرملا کچھ دن روئی، لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ کیوں رو رہی ہے۔ کامتا پرشاد اس کے شوہر سہی، اس کے بیٹے کے باپ سہی، لیکن ان کی سنک شادی کے بعد اور بھی بڑھ گئی تھی اور باوجود کوشش کے وہ ان کے قریب نہیں آ سکی تھی۔ بلکہ جب ان کا جنون زیادہ ہوتا تو دو ایک بار انھوں نے

---

(۱) وہ روزہ جو سہاگ ہمیشہ قائم رہنے کے لیے رکھا جاتا ہے۔

اسے بری طرح مارا بھی تھا۔ ساس سسر بمشکل اسے بچا سکے تھے۔ پھر اسے یہ کہہ کر دلاسہ دیا تھا، ''ارے بہو اس نے تمھیں جان بوجھ کر تو مارا نہیں۔ تم تو جانتی ہو کبھی کبھی اس کا دماغ ذرا خراب ہو جاتا ہے۔'' لیکن نرملا بہت ڈر گئی تھی۔ شوہر کے پاس اکیلے جاتے ہوئے اسے بڑا ڈر لگتا تھا اور جب کامتا پرشاد غصے میں خود ہی خود بڑ بڑاتے تو وہ خوف سے لرزنے لگتی۔ ان کے جانے کے بعد جو بھی سہی کم از کم اس دہشت سے تو اسے نجات مل گئی۔ وہ روتی تو اس لیے تھی کہ سارا خاندان اسے ابھاگنی کہہ کہہ کر رو رہا تھا اور اسے بھی اپنے بھاگ پر رونا آ گیا تھا۔

دو سال اور گزر گئے۔ اب راجندر ذرا بڑا ہو گیا۔ اس کے پرانے اسکول کی ہیڈ مسٹریس نے ایک دن اسے بلایا۔ ویسے بھی کبھی کبھی وہ ان سے ملنے جاتی تھی۔

مس روز بڑی اچھی خاتون تھیں۔ چالیس سال کے پیٹے میں آ گئی تھیں لیکن اب تک شادی نہیں کی تھی اور نہ کرنے کا ارادہ تھا۔ نرملا سے انہیں بڑی توقعات تھیں جو اب ٹوٹ گئی تھیں لیکن کامتا پرشاد کے غائب ہونے کے بعد سے انہیں اس سے بڑی ہمدردی ہو گئی تھی۔ اس دن انھوں نے ایک خاص وجہ سے بلایا تھا۔ جب نرملا پہنچی تو وہ کچھ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں، پھر بولیں، ''نرملا، کچھ ٹھیک کیا ہے کہ اب کیا کرو گی؟''

نرملا نے ان کی طرف تعجب سے دیکھا۔ وہ بھی کیا بچوں جیسی باتیں کر رہی تھیں۔ اسے کب یہ موقع ملا تھا کہ وہ اپنی زندگی کے لیے کوئی فیصلہ کر سکے۔

مس روز نے ذرا وضاحت سے سمجھایا، ''تم کب تک اس طرح انتظار میں بیٹھی رہو گی؟ اب بچہ بھی ذرا بڑا ہو گیا ہے۔ لڑکیوں کے لیے ٹیچرز ٹریننگ کالج کھلنے والا ہے۔ تم داخلہ لینے کے لیے عرضی دے دو۔ پڑھائی میں ہمیشہ اچھی رہی ہو۔ ضلع بھر میں اوّل آئی تھیں۔ تمہارے لیے وظیفہ ملنا بالکل دشوار نہیں۔ میں بھی کوشش کروں گی۔ اگر تم ٹریننگ لے لو تو نوکری بڑی آسانی سے مل جائے گی۔''

نرملا بولی، ''مس صاحب، مجھے کون پڑھنے دے گا؟ ساس سسر تو بالکل راضی نہیں ہوں گے۔''

مس روز کچھ سوچ کر بولیں، ''مجھے کوشش کرنے دو۔ ہو سکتا ہے وظیفے کی وجہ سے راضی ہو جائیں۔ گھر میں اتنے لوگ ہیں۔ بچے کی دیکھ بھال میں مشکل نہیں ہونا چاہیے۔ جب تک تم کالج میں رہو گی کوئی نہ کوئی اسے سنبھال لے گا۔ تم ٹریننگ کر کے نوکری کر لو تو بچے کے لیے اچھا ہی ہے۔''

نرملا ان کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھ کر بولی، ''مس صاحب آپ سسر جی کو راضی

کرلیں۔ میں تو پڑھائی چھوڑنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ لیکن میری کون سنتا ہے۔'' پھر اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔

کسی طرح مس روز نے نرملا کے سسر اور باپ کو بلا کر انہیں اونچ نیچ سمجھا کر راضی کرلیا۔ کالج سے اس کے لیے ۵۰ روپیہ مہینہ وظیفے کا انتظام بھی ہوگیا۔ سسرال والوں پر اس کے اخراجات کا بار بھی اٹھ گیا۔ دو سال بعد ٹرینگ کر کے گھر کے پاس ہی ایک اسکول میں اسے نوکری مل گئی۔ سسرال والوں کو احساس ہوا کہ سودا خراب نہیں ہوا تھا۔ پاگل بیٹے کی بہو نہ صرف ذہین اور خدمت گزار تھی بلکہ ہر مہینے تنخواہ بھی ساس سسر کے ہاتھ پر لا رکھتی۔ نرملا کی ذاتی زندگی میں کچھ ہوا یا نہیں لیکن خاندان کی نظر میں اس کی قیمت بڑھ گئی۔

زندگی ایک دھارے پر چلتی رہی۔ دن برسوں میں بدل گئے اور نرملا کا ننھا سا بیٹا، جس کا پاگل باپ ایک دن سب کی آنکھوں سے غائب ہوگیا تھا، بڑھ کر تارے کی طرح چمکا۔ سب کی نظریں اس پر اٹھتی تھیں۔ جب چھوٹا سا تھا تو نرملا کو اور ماؤں کی طرح اس کی دیکھ بھال کا موقع نہیں ملا۔ لیکن جب ذرا بڑا ہوا تو اس کی پڑھائی لکھائی کی ذمہ داری ماں نے خود ہی لے لی۔ وہ بھی نرملا ہی طرح ذہین نکلا۔ ماں کی ہی طرح اسے بھی ایک کے بعد ایک وظیفہ ملتا گیا، اور جس دن ڈاکٹری پاس کرنے کے بعد اس کے دادا نے ہسپتال میں اور ڈاکٹروں کے ساتھ اسے سفید کوٹ پہنے دیکھا تو انہیں محسوس ہوا کہ راجندر کو نہیں کا متا پرشاد کو دیکھ رہے ہیں۔ ماں باپ کی محبت کے کرشمے بھی عجیب ہوتے ہیں۔

راجندر محض ذہین ہی نہیں تھا، اسے لوگوں کے دل لبھانے اور ترقی کرنے کے بھی گر آتے تھے۔ بلکہ ترقی کرنا اور دولت کمانا اس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد تھا۔ ملازمت کرنے کے ایک سال بعد ہی اسے محسوس ہوا کہ اس چھوٹے سے ضلعے کے بوسیدہ ہسپتال میں زیادہ دن کام کرنا ساری امیدوں کو خیر باد کہنے کے برابر ہے۔ بھاگ دوڑ اور میڈیکل کالج کے استادوں کی مدد سے اسے آگرہ کے میڈیکل کالج میں نوکری مل گئی اور جب کچھ عرصے بعد امریکن ڈاکٹروں کا ایک وفد آیا تو ان کی نظریں خاص طور پر راجندر ہی پر پڑیں۔ اس نے بھی جس طرح ان کی مدد اور دیکھ بھال کی تھی یہ کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ ویسے بھی وہ بلا کا ذہین تھا۔ اس کا دماغ ایک مقناطیس کی طرح تھا جو ہر علم کو اپنی طرف کھینچ کر اپنا لیتا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے جو بے انصافی قدرت نے اس کے باپ کے ساتھ کی تھی اس کی تلافی کی ہو۔ اس کے سانولے رنگ، لمبے قد، چھریرے بدن اور تیکھے نقش ونگار میں بڑی جاذبیت تھی۔ کتنی لڑکیاں تھیں جنھوں نے اسے اپنانا چاہا۔ لیکن غربت نے اسے دو باتیں

سکھائی تھیں، ''سب سے جھک کر ملو اور اپنے فائدے اور ترقی کو ہر وقت مدِ نظر رکھو۔'' اس کے لیے لڑکیوں میں بہت کشش سہی لیکن وہ کسی سے بھی ساری زندگی کے لیے گانٹھ باندھنے کو تیار نہیں تھا۔ اس کے علاوہ بہت کچھ دینے پر بھی قدرت نے اسے محبت کرنے کی نعمت سے محروم ہی رکھا تھا۔ سب کے ساتھ رہ کر بھی وہ اکیلا ہی تھا۔ دوستوں، رشتہ داروں اور ان لڑکیوں کے لیے جنھوں نے اس سے محبت کی تھی، اس کے دل کی گہرائیوں میں کوئی مستقل جگہ نہ تھی۔ وہ سطحی طور پر سب سے ہی بڑے سلیقے اور خوش مزاجی سے ملتا تھا لیکن ان میں کوئی ایسا نہیں تھا جس کی غیر موجودگی سے اس کی دنیا سونی ہو جائے۔ شاید یہ بیگانگی اسے اپنی ماں سے ملی تھی جن کے دل کا کنول کبھی کھلا ہی نہیں تھا، جن کے جذبات ایک ایسے چشمے کی طرح تھے جس کو پھوٹتے ہی بند کر دیا جائے اور محبت کا جو انکور ہر انسان یگ یگ سے اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے اسے سینچنے اور سنبھالنے والا انہیں کوئی ملا ہی نہیں تھا۔ ابھی اس نے جوانی کی پہلی منزل میں ہی پیر رکھا تھا کہ سامنے کا منظر دیکھ کر وہ سہم گئی تھی اور اس سہمی ہوئی لڑکی کی گود بھری تو اس سے پہلے کہ وہ اپنے ہوش و حواس میں آکر اپنے بچے کو دل بھر کر پیار کرے ضرورتوں اور دور اندیشیوں نے اس کی ممتا کو ایک تناور اور شاداب درخت نہ بننے دیا۔ اسے بیٹے سے محبت تھی لیکن وہ دونوں ایک دوسرے سے کچھ دور دور ہی رہے۔ جب پڑھائی اور نوکری کے تقاضوں کو پورا کرنے کے بعد اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو راجندر چھوٹا سا بچہ نہیں تھا جسے اٹھا کر وہ اپنی بانہوں میں بھینچ لیتی۔ وہ بڑا ہو چکا تھا۔ اپنی پڑھائی اور ہم عمر بچوں کے ساتھ کھیلوں میں مشغول تھا۔ نرملا نے اس کی نگہداشت، ضرورتیں پوری کرنے پر ہی اکتفا کر لی اور جب راجندر نے آگرے سے آکر سب کو بتایا کہ اسے امریکہ جا کر پڑھنے کے لیے وظیفہ ملا ہے تو اسے خوشی اور غم دونوں ہی ہوئے۔ خوشی بیٹے کی ترقی پر اور دکھ اس کے اتنی دور جانے پر۔ لیکن پاس رہ کر بھی وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب کب آئے تھے۔ جب وہ گھر آتا تو اس کی آواز سن کر نرملا کا دل کھل اٹھتا تھا۔ وہ آکر اس کے پیر چھو کر جب سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھتا تو اس کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں نرملا کو کامتا پرشاد کی یاد دلا دیتیں اور برسوں بعد بھی اس کا دل دھک سے ہو جاتا۔

ایک دن وہ بھی آگیا کہ راجندر اس کو اکیلا چھوڑ کر امریکہ چلا گیا۔ نرملا نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دیں لیکن خواہش ہونے پر بھی یہ ہمت نہیں ہوئی کہ اسے گلے لگا کر کہے کہ ''تم بھی اپنے باپ کی طرح مجھے چھوڑے جاتے ہو۔ تم تو میری کوکھ میں رہے ہو، پھر بھی ہم دونوں ایک

دوسرے سے اتنی دور کیوں ہیں۔ آؤ اب تو میں تمہیں گلے لگالوں۔'' اس کے لب بند ہی رہے، زبان نے ساتھ ہی نہیں دیا۔ آنسوؤں نے آنکھوں کو ایسا دھندلا دیا کہ وہ نظر بھر کے بیٹے کو دیکھ بھی نہ سکی اور وہ اس کے سامنے سے غائب ہوگیا۔

امریکہ سے برابر خط آتے رہے اور جیسی امید تھی ویسی ہی راجندر نے ترقی کی۔ جلدی جلدی امتحانات ختم کر کے جنرل سرجری میں اسپشلائز کرلیا۔ نوکری ڈھونڈھنے کی ضرورت بھی نہیں پڑی۔ میڈیکل کالج میں انھوں نے اپنا نام راجندر پرشاد سے راجندر کمار کرلیا تھا اور اب وہ پروفیسر کمار ہو گئے۔ اس زمانے میں کتنی لڑکیاں ان کی زندگی میں آئیں اور چلی گئیں۔ انھوں نے ہی زیادہ دن رکنا چاہا اور نہ پروفیسر کمار نے ہی انہیں روکا۔ دو تین سال بعد ایک آدھ مہینے کے لیے وہ گھر بھی ہو آتے۔ لیکن وہاں جاتے ہی خیال ہوتا، ''میں کیوں آیا ہوں؟ ماں سے ملنے؟ لیکن وہ بیچاری تو ہمیشہ ہی سہمی سہمی رہتی ہیں۔ ان سے کھل کر تو کبھی بات ہی نہیں ہو پائی۔ رشتہ داروں کے پاس؟ تو وہ اپنے تحفے لے کر خوش ہو جاتے ہیں، پھر ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھ سے کیا بات کریں۔ اور اس شہر میں آتے ہی میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ تنگ گلیوں میں بدبودار نالیوں کی وجہ سے سانس لیتے ہوئے ڈر لگتا ہے کہ کہیں انفکشن نہ لگ جائے۔'' اور پھر وہ بستر بوریا باندھ کر آگرہ، دہلی، بمبئی اور نہ جانے کہاں کہاں دوستوں سے ملنے نکل جاتا۔ ان کے یہاں کچھ دن مہمان رہ کر بڑے بڑے شہروں کے ہجوم، سمندر کے کنارے یا کسی پہاڑ کی خاموش وادیوں میں گھوم کر وہ پھر واپس چلا جاتا۔ اسے اس دیش کی زمین سے محبت ضرور تھی لیکن جب اس مہان، وشال، سندر اور غریب دیش میں آتا تو اپنے آپ کو اور بھی اکیلا محسوس کرتا۔ نیویارک میں وہ کم از کم مصروف تو تھا۔ ایسا مصروف کہ کبھی کبھی سر اٹھانے کی فرصت نہیں ملتی تھی۔ وہ ترقی کے اس زینے پر آگیا تھا جسے پلیٹو کہتے ہیں اور وہیں اکیلے کھڑے چاروں طرف دیکھ رہا تھا کہ نیا قدم کس طرف اٹھایا جائے۔ زندگی کی اس دوڑ میں اپنے سب ساتھیوں کو چھوڑ کر وہ بہت آگے نکل گیا تھا اور اب گہرا سانس لینے کے لیے رک گیا تھا۔ اسی حالت میں وہ امریکن ڈاکٹر اس کے قریب آگئی۔ اس کا نام ڈوروتھی ایلن تھا۔ وہ دنیا کے سب سے امیر دیش میں پیدا ہوئی تھی۔ ایسے خاندان میں پلی بڑھی تھی جہاں دولت کا مول پانی سے زیادہ نہیں تھا۔ دنیا کی کوئی نعمت کوئی آرام ایسا نہیں تھا جو اس نے چاہا ہو اور نہ ملا ہو، لیکن فرق یہیں ختم ہو جاتا تھا۔ راجندر کی طرح وہ بھی اکیلی تھی۔ ابھی ڈوروتھی سات آٹھ برس کی تھی کہ اس کی ماں اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چل دیں۔ باپ بیوی کے غم میں کچھ دن ایسے کھو گئے کہ انہیں ڈوروتھی کے آنسو

پونچھے، اسے گلے لگانے کا خیال بھی نہیں آیا۔ جب وہ ذرا سنبھلے تو بزنس اور دولت کمانے کے مشغلے میں اپنے غم سے فرار ڈھونڈھ لیا۔ ویسے بھی پریم کا وہ رشتہ جو ہر بیٹی کا اپنے باپ سے ہوتا ہے ان دونوں میں کمزور ہی تھا۔ اس کا اظہار انھوں نے ڈوروتھی کی ہر مانگ پوری کرنے تک ہی رہنے دیا تھا۔ شاید بڑے ہو کر باپ اور بیٹی ایک دوسرے کے قریب آجاتیں لیکن اس کا موقع ہی نہیں ملا۔ راجندر کی طرح وہ بھی بڑی ذہین تھی۔ اگر چاہتی تو عیش وعشرت میں زندگی گزار دیتی۔ مگر وہ شروع سے ہی پڑھائی لکھائی میں ایسی مصروف ہوگئی اور ایسی چمکی کہ سارے اسکول کی نظریں اس پر اٹھ گئیں۔ پھر کالج جا کر ڈاکٹری پاس کی اور راجندر کی طرح سرجن ہو کر میڈیکل کالج میں پڑھانے اور ریسرچ کرنے لگی۔ مردوں کی اس کی زندگی میں کمی نہیں تھی لیکن راجندر کی بڑی بڑی آنکھوں اور سانولے رنگ کی کشش نے اس کا دل موہ لیا۔ راجندر نے بھی جب سے اسے دیکھا تھا وہ محسوس کر رہا تھا کہ ڈوروتھی کے چھریرے بدن، سنہرے بالوں اور نیلی نیلی آنکھوں کی کشش ایک ڈور کی طرح اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ اور دو اکیلے پرانی ایک دوسرے کے قریب آگئے۔ سب کو تعجب بھی ہوا کہ وہ دونوں اتنی جلدی شادی کرنے پر کیوں تیار ہیں۔ ڈوروتھی کے والد کو جھجک بھی تھی اس رشتے سے لیکن جب راجندر سے ملے تو اس نے ان کو بھی موہ لیا۔ ویسے بھی وہ لوگ مارٹن لیوتھر کنگ اور سول رائٹس کی تحریک سے متاثر تھے۔ ان دونوں کی شادی بڑی شان سے ہوگئی۔ راجندر کی عمر اب ۳۵ برس کی ہو چکی تھی۔ ڈوروتھی بھی اس سے صرف دو سال چھوٹی تھی، اس لیے دونوں نے فیصلہ کیا کہ اگر وہ اولاد چاہتے ہیں تو زیادہ دن انتظار کا وقت نہیں ہے اور ایک سال میں ڈوروتھی اور راجندر ایک بڑے پیارے بیٹے کے ماں باپ بن گئے۔ اس کا نام انھوں نے ڈوروتھی کے باپ کے نام پر روجر رکھا۔ انہیں محسوس ہوا اب ان کی زندگی بھرپور ہوگئی ہے۔ دنیا کی ہر نعمت اور آسائش انہیں میسر تھی اور اب بچّے کی آمد نے خوشیوں سے انہیں سرشار کر دیا۔

کسی نے سچ کہا ہے، دنیا کی ہر نعمت آنی جانی ہے۔ اور خوشیاں تو ایسا نازک پھول ہیں کہ انہیں کتنا ہی سنبھال کر رکھیں لیکن انہیں بقا کہاں۔ ان دونوں کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ نہ جانے کیا ہوا کہ دونوں کو ایک دوسرے سے جو توقعات تھیں پوری نہیں ہوسکیں۔ ڈوروتھی کو دولت، خوبصورتی، عزت اور اب اولاد سب حاصل تھا، پھر بھی محبت کی جو پیاس اسے تھی راجندر اسے نہ بجھا سکے۔ شاید وہ ایسا پریم چاہتی تھی جس کی ہم سب ہی تمنا کرتے ہیں لیکن وہ تو ہمارے خوابوں کو ہی اجاگر کرتا ہے۔ اس کی خوشبو ہمارے ذہن کی پہنائیوں کو ہی معطر کرتی رہتی ہے۔ ڈوروتھی کے خوابوں کو حقیقت بنانے کی صلاحیت

راجندر میں نہیں تھی۔ ان کے بچپن کی یادوں میں میاں بیوی کے پیار کی جھلکیاں تھیں ہی نہیں۔ ویسے بھی ان کا معاشرہ اور مذہب بیوی کے ساتھ مل کر مذہبی اور سماجی فرائض کو ادا کرنے کی تلقین ضرور کرتا ہے، اور اسے ہندوستانی مرد ہزاروں سال سے پورا کر رہا ہے، لیکن رومان ان کی زندگی میں محض قلیل وقفے کے لیے داخل ہوتا ہے اور اس کا رخ سہاگ رات کے بعد بیوی کی طرف کم ہی ہوتا ہے۔ ان کے من کا کنول کب کھلا اور کب اسے دنیاداری کے بوجھ نے دبا دیا، وہ خود بھی نہیں جانتے۔

ڈوروتھی اور راجندر نے اپنی سی بہت کوشش کی کہ اور کچھ نہیں تو بچے کے لیے ہی اپنا بندھن قائم رکھیں، لیکن جس معاشرے میں وہ رہ رہے تھے، جس طبقے سے ڈوروتھی کا تعلق تھا وہاں اس قسم کے سمجھوتوں کا رواج نہیں تھا۔ ان کے لیے طلاق کوئی حشر برپا کرنے والا حادثہ نہیں تھا۔ وہ زندگی کی حقیقت بن چکا تھا۔ کتنا ہی تلخ سہی لیکن امریکن سوسائٹی نے اس سے سمجھوتہ کرلیا تھا۔ پانچ سال بعد ڈوروتھی اور راجندر کے بندھن ٹوٹ گئے۔ زندگی کی راہ پر چلتے ہوئے ایک موڑ پر دو مسافر ملے تھے، کچھ راستے ساتھ چل کر پھر اپنی اپنی الگ راہ پر چل دیے۔ ہاں خاندان اور وکیلوں کی مدد سے یہ ضرور طے پایا کہ بچہ ڈوروتھی کے پاس رہے گا لیکن راجندر کو بھی اس سے ملنے اور کچھ عرصہ اس کے ساتھ گزارنے کا حق دیا گیا۔ اب پروفیسر کمار اس منزل پر پہنچ گئے تھے جہاں سے ان کی ماں تقریباً چالیس سال پہلے گزری تھیں۔ ایک چھوٹے سے بچے اور بوڑھی ماں کے سوا ان کا اپنا کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ دونوں بھی ان سے دور دور اور انجانے تھے۔

پاؤں چھو کر پرنام کے بعد آج وہ اسی انجانی انجانی ماں کے سامنے کھڑے ہوئے سوچ رہے تھے، ''اب ان سے کیا بات کی جائے۔'' نرملا نے بیٹے کی آمد کی خوشی میں ریشم کی ساڑی پہنی تھی۔ اس کے پلّے سے اچھی طرح سر ڈھکے ہوئے وہ بیٹے کے سامنے کھڑی تھیں۔ انھوں نے آنکھوں سے خوشی کے آنسو پونچھ لیے تھے اور بڑے فخر سے سوچا تھا، ''ایسا جوان تو ہمارے رشتہ داروں میں کیا اس شہر میں بھی مشکل سے ملے گا۔'' وہ پہلے جیسی ڈری ڈری اور سہمی ہوئی نہیں تھیں۔ اب وہ ریٹائر ہونے والی تھیں۔ ان کا چھوٹا سا اسکول بہت بڑا ہوگیا تھا اور وہ اس کی ہیڈ مسٹریس تھیں۔ ساس سسر مر چکے تھے۔ وہ اپنا پرانا گھر چھوڑ کر ٹیچرز کے ساتھ ہی ایک چھوٹے سے بنگلے میں رہتی تھیں۔ وہیں دونوں نے ایک زمانے بعد کھل کر باتیں کیں۔

نرملا نے پوچھا، ''بیٹا کب تک اکیلے رہو گے؟''

راجندر بولے، ''وہاں اکیلے رہنے میں میرے لیے کوئی مشکل نہیں ہے لیکن جب بچہ میرے

پاس آتا ہے تو مشکل ہو جاتی ہے۔ اسی لیے سوچ رہا تھا کہ تم میرے لیے جو لڑکی ٹھیک کرو گی اس سے بیاہ کروں گا۔''

نرملا ہکا بکا رہ گئیں۔ انہیں یہ امید نہیں تھی کہ راجندر کبھی بھی ان کی مرضی سے شادی کرنے کی بات کریں گے۔ کچھ دیر رک کر وہ بولیں، ''بھیا تمہارے جوڑ کی لڑکی میں کہاں سے لاؤں گی؟''

راجندر بولے، ''میں ڈاکٹر یا یونیورسٹی کی گریجویٹ لڑکی نہیں چاہتا۔ ایک سیدھی سادی لڑکی ٹھیک کر دو جو بچے کی دیکھ بھال کر سکے، گھر سنبھال سکے۔ میں نہ امیر لڑکی چاہتا ہوں اور نہ دہیج۔ بس تمہاری طرح ہو۔''

نرملا گھبرا کر بولیں، ''بھگوان نہ کرے جو میری جیسی ابھاگی سے تمہارا بیاہ ہو۔'' لیکن چند ہفتے بعد کچھ انہیں کی طرح کی لڑکی سے بیاہ کر کے راجندر بیوی کے ساتھ واپس چلے گئے۔

ان کی بیوی کملا نہ خوبصورت تھیں نہ گریجویٹ تھیں اور نہ امیر، ہاں سگھڑ ضرور تھیں۔ اس نے پانچ بھائیوں کی ماں کے مرنے کے بعد پالا پوسا تھا۔ کم عمری میں ہی باپ کا گھر چلایا تھا۔ میٹرک پاس کرتے ہی اسکول چھوڑ دینا پڑا تھا۔ اور سارے گھر کا بوجھ اٹھالیا تھا۔ اس کے باپ سے لوگ کہتے تھے، بیٹی کا بیاہ کب کرو گے؟ تو وہ سوچتے تھے اگر یہ اپنے گھر کی ہوگئی تو اس گھر کو کون سنبھالے گا؟ اسی وجہ سے وہ پچیس سال کی ہوگئی تھی۔ بچپن میں اس نے نرملا کے اسکول میں پڑھا تھا مگر برسوں بعد بھی وہ برابر نرملا کے پاس آتی اور نرملا، جنہیں دل کھول کر کسی سے محبت کرنا آتا ہی نہیں تھا، اس کے قریب آگئی تھیں۔ جب راجندر نے خود ہی ماں سے بیاہ ٹھیک کرنے کو کہا تو وقت کی کمی کی وجہ سے تلاش زیادہ نہ ہو سکی۔

راجندر بڈھے نہ سہی لیکن چالیس برس کے ہوگئے تھے۔ ان کی صرف ایک ہی شرط تھی کہ لڑکی کم عمر نہ ہو۔ مگر اس چھوٹے سے شہر میں اگر لڑکی میں کوئی عیب نہ ہو تو جوان ہوتے ہی اس کے بیاہ کی جلدی پڑ جاتی تھی۔ زمانہ بدل گیا تھا لیکن اب تک عورت کی زندگی کا سب سے اہم مقصد شادی تھا۔ باپ کی مجبوریوں کی وجہ سے کملا ہی شادی کی عمر پار کر کے اب تک کنواری بیٹھی تھی۔ وقت بھی نہیں تھا کہ زیادہ تلاش کی جاتی اور کملا سے اچھی لڑکی انہیں نہیں مل سکی جو نیک ہو، سگھڑ ہو اور کم عمر بھی نہ ہو۔ ایک دو بار اسے راجندر نے بھی دیکھا تھا۔ جب نرملا سے ملنے آئی تھی تو اس سے باتیں بھی کی تھیں۔ اس سے شادی کرنے میں انہیں کوئی اعتراض نہ تھا۔ بڑی جلد ہی لگن طے ہوگئی اور راجندر بیاہ کر کے

اسے لندن لے گئے جہاں انہیں وزٹنگ پروفیسر شپ کچھ دن کے لیے مل گئی تھی۔

لندن کا قیام کملا کے لیے بہت فائدہ مند ثابت ہوا۔ اس نے ایک چھوٹے سے شہر میں زندگی گزاری تھی۔ لندن دیکھ کر ہی وہ ہکا بکا ہوگئی۔ امریکہ اور نیویارک کا تصور بھی اس کے خواب وخیال میں نہیں تھا۔ انگریزی اس نے میٹرک تک پڑھی تھی لیکن انگریزی میں گفتگو کرنا تو درکنار، انگریزوں کی بات ہی اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ بڑی جلدی ہی ایک انگریز عورت اسے انگریزی سکھانے کے لیے رکھ دی گئی۔ اس کے علاوہ خریداری کرنا، ایک نئے ملک اور معاشرے میں گھرداری کرنا، قیمتی ساڑیاں پہننا اور میک اپ کرنا اس نے ہندوستانی ڈاکٹروں کی بیویوں سے سیکھ لیا۔ وہ بھرے پرے گھر سے آئی تھی، پانچ بھائیوں اور باپ کی دیکھ بھال کی تھی۔ اس کا دن ایسے گزر جاتا کہ اسے پتہ ہی نہ چلتا۔ لیکن لندن آکر وہ اپنے آپ کو بڑا اکیلا محسوس کرنے لگی۔ راجندر دن بھر ہسپتال میں رہتے۔ کام کرنے کی انہیں لت ہوگئی تھی اس لیے ڈھونڈھ کر کام نکال لیتے۔ روز بڑی دیر سے گھر واپس آتے۔ چھٹی کا دن بھی آپریشن اور کانفرنسوں میں گزر جاتا۔ کملا کو محسوس ہوا کہ ساری دولت اور آرام کے باوجود بھی دن کاٹے نہیں کٹتے۔ اس کی جان پہچان والیوں نے رائے دی، ڈرائیونگ سیکھ لو، اور چھ مہینے کے بعد جب اس نے راجندر کو بتایا کہ وہ ڈرائیونگ ٹیسٹ دینے جارہی ہے تو وہ ذرا طنزاً ہنس دیے۔ پھر اس کا اداس چہرہ دیکھ کر بولے، ”کوئی بات نہیں۔ دو چار بار فیل تو ہوگی لیکن تجربہ ہوجائے گا کہ ٹیسٹ کیسے دیا جاتا ہے۔“ لیکن یہ جملہ اس کی کامیابی کا راز بن گیا۔ ٹیسٹ کے وقت اس نے بڑے سکون سے کار چلانا شروع کردی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ فیل تو ہوں گی ہی، ڈرنے کی کیا بات ہے۔ ڈرائیونگ کے امتحان لینے والے کو ہندوستانیوں سے بڑی چڑھ تھی مگر اس نے کملا کی طرف نظر بھر کر دیکھا تو اسے محسوس ہوا کہ اس دبلی پتلی سانولی سلونی عورت میں کتنی کشش ہے۔ اس کے کالے کالے گھنگھرالے بالوں کی چوٹی اس کی کمر کو چھو رہی تھی، جس کی مخمل جیسی جلد باریک ساڑی کی تہوں کے نیچے جھلملا رہی تھی۔ پتلی سی ناک میں ہیرے کی کیل جگمگا رہی تھی۔ جب وہ قریب آکر بیٹھا تو اس کے جسم سے چنبیلی کی ہلکی ہلکی خوشبو نے اسے موہ سا لیا۔ کملا بڑے اطمینان سے اس کی ہدایت کے مطابق کار چلاتی رہی اور گاڑی رکوا کر ڈرائیونگ کے متعلق سوالات کیے تو وہ ان کی طرف دیکھ کر اعتماد سے جواب دیتی رہی کیونکہ اس کی یادداشت بہت اچھی تھی۔ اور جب ممتحن نے کہا، ”مجھے یہ بتانے میں خوشی ہو رہی ہے کہ آپ پاس ہوگئی ہیں،“ تو وہ ہکا بکا رہ گئی۔ شام کو جب اس نے راجندر کو بتایا کہ وہ ٹیسٹ میں کامیاب ہوگئی تو وہ چونک

پڑے۔ پھر ہنس کر بولے، ''اسے اناڑی کی خوش قسمتی کہتے ہیں۔'' کملا نے ان کی طرف مایوسی سے دیکھا لیکن کچھ بولی نہیں۔ اس کے بعد جہاں گھر کی دیکھ بھال راجندر کے ہر آرام اور ضرورت کی ذمہ داری اس پر تھی ان کی شوفری بھی اس نے سنبھال لی کیونکہ انہیں لندن میں گاڑی چلانا اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس تجربے سے بھی اس کی شخصیت کو ابھرنے کا موقع ملا۔ اس میں ذہانت تھی۔ آزادی اور اپنے سے زیادہ پڑھے لکھے لوگوں کی محبت ملی تو اس کے خیالات میں ایک نئی تبدیلی آ گئی۔ مگر ایک گھر میں رہنے، ایک پلنگ پر سونے اور جسمانی قربت کے باوجود بھی ان دونوں کا پورن ملن نہیں ہوا۔

اسے معلوم تھا کہ اب بھی عورتوں میں راجندر کے لیے کتنی کشش تھی اور ان کی آنکھوں کی چمک ان کے چہرے کا رنگ کسی خوبصورت عورت کی موجودگی میں کس طرح بدل جاتا ہے۔

وقت کتنی تیزی سے گزر جاتا ہے لیکن اپنی گہری لکیریں ہمارے اوپر چھوڑ جاتا ہے۔ کبھی کبھی اس انوکھے مصور کا برش اپنی ایک ہی جنبش سے ہماری زندگی کے دھارے کو بدل دیتا ہے۔ کملا کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ وہ ایک اجنبی آدمی کے ساتھ ایک ایسی اجنبی دنیا میں آ گئی تھی جس کا خیال اسے خواب میں بھی نہیں آیا تھا۔ ہندوستان سے لندن، پھر امریکہ۔ اتنے لمبے سفر کے بعد جب اس نے سانس لیا تو اسے احساس ہوا کہ صرف اس کا ماحول ہی نہیں بدلا وہ خود بھی بدل چکی ہے۔ اس نے اپنے ماحول، اپنے شوہر، اپنے آپ کو ایک نئی نظر سے دیکھنا شروع کیا تھا۔ ویسے بھی اس کا تعلق اس نسل سے تھا جو ہندوستان کی آزادی کے کافی عرصے بعد پیدا ہوئی تھی۔ چھوٹے شہروں میں تبدیلی کی رفتار کتنی ہی سست سہی لیکن اس کی نسل کی عورتوں کے لیے تعلیم حاصل کر کے مردوں کے دوش بدوش کام کرنا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ کم عمری میں ہی اس نے چھوٹے چھوٹے پانچ بھائیوں کو صرف پالا پوسا ہی نہیں تھا ان کی ذہنی نشو ونما بھی کی تھی۔ وہ ان کی دیدی تھی اور اس رشتے سے ان پر حکومت بھی کی تھی۔ باپ بڑے پیار سے اسے رنو کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ سچ مچ اس چھوٹے سے خاندان کی رانی تھی۔ کسی سے دب کر رہنا اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ راجندر کو جلدی ہی پتہ لگ گیا کہ اس سیدھی سادی سگھڑ لڑکی میں ایک چنگاری بھی چھپی ہوئی ہے جو کبھی بھی بھڑک سکتی ہے۔ انہیں سوچ و چار کا موقع زیادہ نہیں ملتا تھا۔ کملا جلدی ہی ماں بن کر اس نئی خوشی، ذمہ داری اور مصروفیت میں کھو گئی۔ راجندر نے بھی دوبارہ ایک چھوٹے سے بیٹے کا باپ بن کر ایک نئی خوشی محسوس کی اور کچھ دن کے لیے مصروفیتیں کم کر دیں۔ لیکن پرانی عادتیں مشکل سے چھوٹتی ہیں۔ کچھ دنوں بعد ان کی زندگی پھر پرانے

ڈھرے پر آ گئی۔ کملا کی ذمہ داری صرف اپنے بچے کی نگہداشت ہی نہیں تھی۔ جب راجندر کا بیٹا روجر ان کے پاس آتا تو اس کی بھی دیکھ بھال کملا ہی کرتی کیونکہ وہ بھی اسی خاندان کا بیٹا تھا اور گھر کے لوگوں سے پیار کرنا، ان کی ضروریات کا خیال رکھنا اس کی عادت بن چکی تھی۔ نیویارک جیسے شہر میں رہ کر بھی وہ اپنی چھوٹی سی دنیا میں کھوگئی تھی۔ لیکن راجندر اس کا ساتھ زیادہ دن نہیں دے سکے۔ چھوٹا سا بیٹا بھی اب اتنا بڑا ہوگیا تھا کہ گھر کے قریب کی نرسری میں جانے لگا تھا تاکہ دوسرے بچوں کے ساتھ مل کر کھیلے کودے اور کچھ سیکھے بھی۔ کملا نے کچھ اکیلے پن ختم کرنے اور کچھ ذہنی آسودگی کی تلاش میں کالج میں داخلہ لے لیا۔ اسے یہ بھی احساس تھا کہ اور ڈاکٹروں اور راجندر کے دوستوں کی بیویاں کافی تعلیم یافتہ تھیں اور ان میں سے کئی خود بھی ڈاکٹر تھیں۔ اسے پہلی بار موقع ملا تھا کہ باہر کی کھلی ہوئی ہوا میں سانس ہی نہ لے سکے بلکہ اپنی دبی ہوئی ذہانت کو جلا بھی دے سکے۔ اس کی زندگی ایک ہموار راستے پر چل رہی تھی۔ ڈوروتھی کی طرح راجندر سے اسے والہانہ محبت کی توقع تو نہیں تھی لیکن ایک خالص ہندو بیوی کی طرح شوہر اس کے لیے دیوتا نہیں تھا۔ اس نئے معاشرے اور کالج کی فضا نے اسے گہرائی سے سوچنے اور سمجھنے کی طرف مائل کر دیا تھا۔

چھٹی کا زمانہ تھا۔ اس بار روجر اپنی ماں کے پاس گیا تھا۔ وہ اپنے بچے کو لے کر کچھ عرصے کے لیے ہندوستان چلی گئی۔ جب واپس آئی تو معلوم ہوا راجندر ایک کتاب لکھنے میں بڑے مصروف ہیں۔ ہسپتال میں کام کرنے کے بعد رات کو بڑی دیر تک اپنے پڑھنے کے کمرے میں اکیلے بیٹھے کتاب پر کام کرتے رہتے۔ یا ان کی سکریٹری گھر آ کر ان کے ساتھ کام کرتی۔ بھرے پرے گھر سے آنے کے بعد کملا کو اکیلا پن کھل رہا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں جن عورتوں سے اس کی دوستی تھی وہ اپنی مشغولیات میں مصروف تھیں۔ یہ سچ ہے کہ راجندر اپنی کتاب میں بے حد مشغول تھے۔ وہ جانتی تھی کہ ان کا کام ہی ان کی زندگی کا سب سے اہم حصہ تھا۔ شاید یہ بھی وجہ تھی کہ باوجود کوشش کے وہ دونوں ایک دوسرے کے زیادہ قریب نہیں آ سکے تھے۔ مگر اس بار اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ دوری اور بھی بڑھ گئی ہے، جیسے کوئی اور چیز مخل ہوگئی ہے۔ جب وہ ہندوستان میں تھی راجندر کہاں کہاں گئے تھے، کن کن خواتین سے ذرا زیادہ ہی قریب آ کر ملے تھے، اس کی بھنک اس کے کانوں میں پڑ گئی تھی۔ لیکن ہندوستانی بیوی ان باتوں سے جلدی ہی بھڑک نہیں جاتی۔ کملا اب نئی نویلی دلھن نہیں تھی۔ ایک بچے کی ماں بن چکی تھی۔ سوتیلا ہی سہی، ایک اور بھی بچہ اس سے مانوس ہو چکا تھا۔ شوہر، گھر اور

بچوں کی جو ذمہ داریاں اس پر تھیں ان کا اسے اچھی طرح احساس تھا۔ ان ذمہ داریوں کو نبھانے کے لیے نسل در نسل عورتوں نے جو قربانیاں دی ہیں وہ انہیں بھی جانتی تھی۔ لیکن اس طرح کی قربانیاں دینا اس کے لیے اب ممکن نہیں تھا کیونکہ وہ ایسے معاشرے اور عہد میں رہ رہی تھی جہاں عورت برابر کا درجہ چاہتی ہی نہیں اسے اپنا حق سمجھتی ہے۔

اس شام ایک خلش سی اس کے دل و دماغ میں کھٹک رہی تھی۔ حسب معمول بچہ دن بھر کے کھیلوں کے بعد تھک کر اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔ راجندر سارے دن اپنی سکریٹری کے ساتھ کام میں مشغول تھے۔ اسے ایسا لگا کہ ساری دنیا میں وہ اکیلی ہے، سوائے اپنے ننھے سے بیٹے کے۔ نیویارک کے باہر کے علاقے میں ان کے گھر کے چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کھانے کی میز سجا کر اس نے ان کے کمرے کے دروازے پر جا کر دستک دی۔

''راج، دیر ہوگئی ہے۔ کھانا کھالو پھر کام کرنا۔''

راجندر نے دروازہ کھول کر سر باہر نکالا۔ اسے محسوس ہوا وہ گھبرائے ہوئے ہیں۔ ان کے گھنے بال ذرا بکھرے تھے۔ چہرے کا رنگ فق ہو رہا تھا۔ ''ابھی آتا ہوں،'' انھوں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ پھر آہستہ سے بولے، ''کیا انیتا سے بھی کھانے کے لیے کہوں؟'' کملا نے نظر بھر کر ان کی طرف دیکھا، ''ہاں ضرور۔ پوچھنے کی کیا بات ہے؟'' اس نے جواب دیا۔

تھوڑی دیر میں راجندر اپنی سکریٹری انیتا کو لے کر کھانا کھانے آگئے۔ کملا نے آج ان کا من بھاتا کھانا پکایا تھا لیکن وہ اسے خاموشی سے کھاتے رہے، کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے، مگر ان کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ اپنے جذبات کو چھپانا چاہ رہے ہیں۔ انیتا نے کھانے کی تعریف کی، باتیں کرنے کی کوشش کی، لیکن راجندر خاموش ہی رہے۔ کافی پینے کے کچھ دیر بعد راجندر انیتا کو کار میں اس کے گھر لے گئے اور کملا مشین کی طرح باورچی خانے کا کام نبٹا کر سونے سے پہلے نہانے کے لیے غسلخانے میں چلی گئی جہاں نرم قالین فرش پر بچھا ہوا تھا، لیکن اس وقت وہ قالین اس کے پیروں میں چبھ سا رہا تھا۔ اس نے گرم اور ٹھنڈے پانی کے نل کھول دیے جو سنہرے ہنسوں کے سر اور گردن کی شکل کے تھے۔ اس نے انہیں بڑے شوق سے لگوایا تھا، لیکن آج وہ اسے بڑے بدصورت معلوم ہو رہے تھے۔ غسلخانے کی سنگ مرمر کی دیواریں، موٹے موٹے نرم تولیے اور ہر آسائش کی چیز اسے لگا اس کا منہ چڑا رہی ہے۔ خوبصورت حمام (باتھ) سے صابن کے جھاگ اٹھ اٹھ کر فرش پر گرنے کے قریب ہوگیا۔ وہ چونکی اور کپڑے اتار کر باتھ

میں اتر گئی۔ نرم اور گرم جھاگ نے اسے اپنی گود میں چھپا لیا۔ اسے لگا جیسے وہ اسے تھپک تھپک کر دلاسہ دے رہا ہے۔ اس کے آنسوؤں کا باندھ ٹوٹ گیا۔ اسے معلوم نہ ہوا وہ کتنی دیر تک پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔ راجندر نے بیڈروم میں آکر آواز دی، ''میں آگیا ہوں۔ دیر ہو گئی ہے، آؤ سو جاؤ۔''

جب وہ ڈریسنگ روم سے نکلی تو اس نے دیکھا راجندر پلنگ میں لیٹے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ جب وہ ان کے قریب آکر لیٹی تو انھوں نے اسے زور سے اپنی بانہوں میں جکڑ لیا۔ وہ ان خوش قسمت مردوں میں تھے جن میں عمر کے درمیانی حصے میں بھی بڑی کشش باقی رہتی ہے۔ ہمیشہ ہی ان کی بانہوں میں اس کا جسم سیسے کی طرح پگھل جاتا تھا، لیکن آج ان کا پیار اسے بالکل جھوٹا لگ رہا تھا اور اس کا جسم سیسے کی طرح پگھل جانے کے بجائے پتھر کی طرح سخت اور ٹھنڈا ہو گیا۔

راجندر نے چونک کر پوچھا، ''کیا ہوا؟''

''کچھ بھی نہیں،'' اس نے سرد مہری سے جواب دیا۔

''پھر تم ناراض کیوں ہو؟''

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اسے لگا آنسو اس کا گلا روندھ دیں گے۔ لیکن بڑے ضبط سے بولی، ''سب کچھ جانتے ہوئے بھولے نہ بنو۔''

راج بولے، ''کیا اتنی رات گئے لڑنا چاہتی ہو؟''

وہ بولی، ''نہیں مجھے لڑنے کی ضرورت نہیں۔ بس اتنا یاد رکھو میں بیوقوف نہیں ہوں۔''

اس نے دیکھا ان کے چہرے پر وہی احساسات تھے جو اس نے اپنے بھائیوں کے چہرے پر دیکھے تھے جب اس نے انہیں غلطی کرنے پر ڈانٹا تھا۔ ان کی طرف پیٹھ کر کے اس نے آنکھیں بند کر لیں لیکن نیند اس سے کوسوں دور تھی۔ وہ بڑی دیر تک ہلکی ہلکی روشنی میں کمرے کو دیکھتی رہی۔ اس کی نظر میز پر رکھے ہوئے سنگ مرمر کے سنگھار دان پر پڑی جو راجندر ڈوروتھی کے لیے اٹلی سے لائے تھے، لیکن وہ ہر چیز جو اسے راجندر نے دی تھی چھوڑ گئی تھی۔ اس نے من ہی من میں کہا، ''میں ڈوروتھی نہیں کملا ہوں۔''

نہ جانے کتنی دیر تک لیٹی لیٹی وہ نیند کا انتظار کرتی رہی لیکن وہ اس سے کوسوں دور تھی۔ آخر تھک کر وہ آہستہ سے اٹھی اور ڈریسنگ گاؤن پہن کر ننگے پاؤں ہی راجندر کی اسٹڈی میں چلی گئی۔ وہیں کھڑکی کے پاس والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ چودھویں کے چاند نے ہر چیز پر اپنا جادو ڈال دیا تھا اور ایسا لگتا تھا جیسے وہ خوابوں کی دنیا ہو۔

کبھی کبھی اس کے گھر سے دور شاہراہ پر گزرتی ہوئی کار اس خاموشی میں لہریں پیدا کرتی ہوئی گزر جاتی اور پھر چاروں طرف سکوت چھا جاتا۔ لیکن اس جادو جیسی نگری میں بھی اس کے لیے سکون نہیں تھا۔ من کی وہ شانتی جس کے متعلق اس نے سوچا ہی نہیں تھا اسے محسوس ہو رہا تھا کتنی بڑی نعمت ہے۔ وہ گھر اور دنیاداری کے فرائض میں ایسی گھر گئی تھی کہ اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ کون ہے؟ کیا چاہتی ہے؟ کدھر جا رہی ہے؟ اور آج آدھی رات گئے وہ یہی سوالات اپنے آپ سے کر رہی تھی۔ اسے خود اپنی تلاش تھی اور اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھری ہوئی ہے۔ کبھی بیٹی، کبھی بہن اور کبھی بیوی اور ماں بن کر اس نے سیوا ہی کی تھی۔ اپنی طرف اس کا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ اپنی زندگی کا کوئی اہم فیصلہ اس نے خود نہیں کیا تھا۔ اپنا جیون ساتھی چننے کے لیے بھی نہیں۔ بس یہی کافی تھا کہ راجندر نے اسے اور اس نے راجندر کو دیکھا تھا اور اس نے سوچا تھا، ''میرے بھاگ کیسے اچھے ہیں،'' کیونکہ اس کے باپ نے کہا تھا ''رنو ہمیں تو معلوم ہی نہیں تھا کہ تو رانی جیسا بھاگ لے کر آئی ہے۔ تیرے لیے ایسا بر تو ہم سات جنم بھی اپنے آپ نہ ڈھونڈھ پاتے۔ بیٹا تو اپنے گھر سکھی سکھی جا۔ میری فکر نہ کر۔ اب میری دیکھ بھال تیری بھابیاں کریں گی۔''

''کیا ان کے لیے بھی میں دیکھ بھال ہی کرنے والی تھی؟'' اس نے سوچا۔ آج وہ بہت تلخ ہو رہی تھی۔

''یہ سچ ہے راج نے مجھے کوئی دکھ نہیں دیا۔ جو چاہوں خریدوں، جتنا چاہوں خرچ کروں۔ رہنے کو اتنا بڑا گھر، الگ کار، کبھی کچھ ہے لیکن مجھے معلوم ہے انہیں مجھ سے محبت نہیں ہے۔ اور نہ میں نے ان سے مانگی۔ لیکن کیا برابری اور وفاداری بھی میرا حق نہیں ہے؟'' پھر اسے خیال آیا کہ یہ سوال اس نے پہلے کبھی کیا ہی نہیں۔ خود سے بھی نہیں۔ اور بلا مانگے کون اتنے بڑے حق دیتا ہے؟ اس نے اپنی جان پہچان والی ہندوستانی عورتوں کے متعلق سوچا۔ ''وہ سب اپنے اپنے گھروں، شوہروں اور بچوں کی دیکھ بھال میں لگی ہوئی ہیں۔ کیا برابری حاصل کرنے کا خیال ان کے دل میں آیا ہے؟ ہم نے تو کبھی یہ باتیں کی ہی نہیں۔ کیوں؟'' پھر اس نے سوچا، یہ عورتیں جو اپنا دیس، اپنا خاندان سب ہی چھوڑ کر یہاں آ گئیں، انھوں نے اپنی زندگی ہی بدل ڈالی۔ مرد جو وہاں کرتے تھے یہاں بھی وہی کرتے ہیں، کاروبار اور نوکریاں۔ لیکن انھوں نے تو اپنی زندگی کے ڈھرے کو ہی بدل ڈالا۔ یہ سچ ہے وہ بھی نوکریاں کرتی ہیں، کاریں چلاتی ہیں، بچے بھی پیدا کرتی ہیں اور ان کی ہی نہیں سارے خاندان

کی نگہداشت کرتی ہیں۔ ان میں اور ان کی ماؤں میں کیا فرق ہے، وہ جنھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کی تھی، نوکریاں نہیں کی تھیں۔ ہم نے تو سارا بار اپنے شانوں پر اٹھالیا ہے لیکن برابری کا حق نہیں مانگا۔ پھر اسے اپنی ساس کا خیال آیا، کس طرح انھوں نے اپنی ساری زندگی گزار دی۔ اکیلے ہی اس راستے پر چلتی رہیں جہاں ان کا کوئی ساتھی نہیں تھا۔ لیکن آگے ہی بڑھتی رہیں۔ انھوں نے اپنے لیے کسی سے بھی کچھ نہیں مانگا۔ وہ اور ان جیسی عورتیں کرم یوگی (۱) تھیں۔ وہ نروان حاصل کرنے کے لیے دنیا چھوڑ کر پہاڑوں کی گپھاؤں اور بنوں میں نہیں گئیں لیکن آگے ہی بڑھتی رہیں۔ ہم بھی اسی راستے پر سفر کر رہے ہیں جس پر وہ ہم سے پہلے گزری تھیں۔ نہ جانے کتنی صدیوں کے بعد انھوں نے ایک نئے راستے پر سفر شروع کیا تھا۔ ہم اب بھی اس پر ہی چل رہے ہیں۔ اس عرصہ میں مغربی عورت کتنی آگے نکل گئی۔ لیکن ہم مغربی عورتیں تو نہیں ہیں۔ ہم ان کی تو نقل نہیں کر سکتے کیونکہ ہمارا اتہاس الگ ہے، ہماری سبھیتا الگ ہے۔ سیکڑوں سالوں کے بعد ہم نے پیروں کی بیڑیاں کاٹ ڈالی ہیں اور ہمارا سفر جاری ہے لیکن ہمیں اب تک اپنی منزل کی تلاش ہے۔

(۱) وہ انسان جس کا کام ہی اس کی عبادت ہوتا ہے۔

فیروز مکر جی

دور کی آواز

فیروز اپنے وطن سے بہت دور ہیں مگر اس دوری کے باوجود نہ تو انھوں نے اپنی زمین سے قربت کا احساس ترک کیا ہے اور نہ اس کی خرابیوں اور خامیوں کو درگزر کیا ہے۔ اس اعتبار سے ان کی بالغ نظری قابل رشک ہے۔ ان کے اکثر معاصر دور دراز بسے ہوئے اہل وطن اکثر یا تو مغرب سے اس قدر مرعوب ہو جاتے ہیں کہ اس کی چمک دمک ہی میں کھو کر رہ جاتے ہیں اور وہاں کی زندگی کے درد و داغ و جستجو و آرزو تک نہیں پہنچ پاتے، یا پھر اپنے وطن کی یاد میں بے قرار ہو کر اپنے وطن کی ساری خامیوں اور کمزوریوں کو بھی بھول جاتے ہیں یا ان پر یادوں کے دل نواز پردے ڈال دیتے ہیں۔ فیروز کی کہانیوں میں یہ سب نظر نہیں آئے گا، بلکہ انسان جس طرح ان کے اپنے وطن میں آباد ہے اور انسان جس طرح مغرب میں رہتا اور بستا ہے، دونوں کے درمیان قدر مشترک کی ساری کیفیات کی آئینہ داری کی کوشش ملے گی اور پھر کسی قسم کے ذہنی یا جذباتی تحفظات کے بغیر ملے گی۔ اگر زندگی کی اس مجموعی دل دوز اجتماعیت سے (خواہ وہ فن ہی میں کیوں نہ ہو) کوئی نتیجہ نکلتا ہے تو وہی فیروز کی دریافت ہے اور میرے نزدیک اہم دریافت ہے، خصوصاً آج کل جب ہمارا افسانہ تیزی سے بھول بھلیوں میں گم ہوتا جا رہا ہے۔

ڈاکٹر محمد حسن

افسانہ نگار ڈاکٹر فیروز مکر جی لندن میں مقیم اردو افسانہ نگاروں میں ایک خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ وہ لکھنؤ میں پیدا ہوئیں اور اب عرصۂ دراز سے برطانیہ میں مقیم ہیں۔ انھوں نے رتن ناتھ سرشار کی زندگی اور فن پر مقالہ لکھ کر یونیورسٹی آف لندن سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ان کا یہ مقالہ انگریزی اور اردو میں شائع ہو چکا ہے۔ فیروز مکر جی کے افسانے برصغیر سے شائع ہونے والے مختلف ادبی رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ زیر نظر کتاب ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ تحقیق و افسانہ کے ساتھ ساتھ وہ لندن کے ایک روزنامہ ''آواز'' میں کچھ عرصہ کالم بھی لکھتی رہی ہیں جو بڑی دلچسپی سے پڑھے جاتے تھے۔ ایک زمانے میں انھوں نے لندن سے ایک رسالہ ''جنبش نو'' بھی جاری کیا تھا جس کی پیشانی پر ''خواتین کا ادبی شمارہ'' لکھا ہوتا تھا۔ اس کا عصمت چغتائی نمبر خاص طور پر بہت مقبول ہوا تھا۔

Cover painting: Nahid Raza